Evolution of
Human Consciousness
انسانی شعور کا ارتقاء
(نفسیاتی اور فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ)
ڈاکٹر خالد سہیل

انسانی شعور کا ارتقا

نفسیاتی اور فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ

ڈاکٹر خالد سہیل

انسانی شعور کا ارتقا

بیاد

Hassan Deen

City Book Point کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ ہمارے ادارے کا مصنف کے خیالات سے متفق ہونا یا نہ ہونا ضروری نہیں بلکہ ادارے کے پیش نظر صرف اور صرف تحقیقی کتب کی اشاعت ہے۔

کتاب کا نام : انسانی شعور کا ارتقا
مصنف : ڈاکٹر خالد سہیل
تعداد : 500
مطبع : برکت اینڈ سنز
ایڈیشن : 2012ء
قیمت : -/250 روپے

فہرست

ابتدائیہ

محترم قارئین!

اکیسویں صدی میں انسانیت ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔

ایک راستہ تباہی و بربادی کی طرف اور دوسرا راستہ امن و آشتی کی طرف جاتا ہے۔

آج کے انسانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کس راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔

اگر انہوں نے تباہی و بربادی کا راستہ اپنایا تو وہ ایٹمی بموں اور دیگر مہلک ہتھیاروں سے اجتماعی خودکشی کر لیں گے اور اگر انہوں نے امن و آشتی کی راہ اپنائی تو وہ ارتقا کی اگلی منزل تک پہنچیں گے۔

اکثر انسان زندگی میں غلط فیصلے اپنی کم علمی، جہالت اور تعصب کی وجہ سے کرتے ہیں۔ جوں جوں ہم جدید علوم سے آگاہ ہوں گے، چاہے وہ طب ہو یا سائنس، نفسیات ہو یا روحانیات، سماجیات ہو یا معاشیات، ہم اپنے لیے اور اگلی نسلوں کے لیے دانشمندانہ فیصلے کر سکیں گے اور اس کرۂ ارض کو امن و آشتی کی آماجگاہ بنا سکیں گے۔

یہ کتاب اسی خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی طرف ایک عاجزانہ قدم ہے۔

عزیز قارئین!

یہ کتاب معرضِ وجود میں نہ آتی اگر مجھے City Book Point کے پبلشر آصف حسن صاحب کا وہ غیر متوقعہ محبت نامہ نہ ملتا جس میں انہوں نے میری نفسیاتی اور فلسفیانہ تخلیقات کو سراہا تھا اور میری کتابوں کو چھاپنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ میں نے چند پرانی اور چند نئی تخلیقات کو جمع کر کے یہ کتاب مرتب کی۔ میں اپنے ان دوستوں (رفیق سلطان' امیر حسین جعفری' عبدالغفور چودھری' منصور حسین' عظمیٰ محمود اور گوہر تاج) کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میرے مضامین کا ترجمہ کیا۔ ان سب سے میرا انسان دوستی اور اعلیٰ آدرشوں کا رشتہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب آپ کو انسانی شعور کے ارتقا کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دے گی۔ میرا ایک شعر ہے

صدیوں کی زنجیریں کھینچیں پیچھے کی جانب
پھر بھی آگے بڑھتے رہنا کتنا مشکل ہے

مجھے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

آپ کا ہمسفر

خالد سہیل

email: welcome @ drsohail.com
website: www.drsohail.com

چارلز ڈارون اور انسانی ذہن کا ارتقا

خالد سہیل

چارلز ڈارون نے' جو ایک عظیم سائنسدان اور فلاسفر تھا' انسانی ارتقا کے بارے میں ایسے نظریات پیش کیے جن کو قبول کرنا اس عہد کے مذہبی لوگوں اور علماء کے لیے بہت مشکل تھا۔ ڈارون کی زندگی میں ہی اس کی حمایت اور مخالفت کرنے والوں میں تلخ مناظرے ہوئے لیکن وہ خاموشی سے اپنا تخلیقی اور تحقیقی کام کرتا رہا اور جہالت کی تاریکیوں میں علم کی شمع جلاتا رہا۔ ڈارون نے سائنسی بنیادوں پر ثابت کیا کہ انسان حیوان کی ارتقا یافتہ صورت ہے اور اس کے جسم اور دماغ میں حیوانوں کے جسم اور دماغ میں بہت سی مماثلتیں ہیں۔ بشکوف **Bischoff** کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ڈارون نے کہا کہ شکمِ مادر میں انسانی بچے کا دماغ ساتویں مہینے میں اتنا نشوونما پا چکا ہوتا ہے جتنا کہ بندر کا دماغ جوانی میں ہوتا ہے۔ اسی لیے حیوانوں اور انسانوں کی ذہنی خصوصیات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ ڈارون کے نظریات کی وجہ سے مذہبی' روحانی اور سیکولر نظریات میں جو تضادات تھے وہ سطح پر آ گئے۔ ڈارون کا کہنا تھا کہ انسان کا رشتہ فرشتوں سے زیادہ حیوانوں سے ہے اور انسانی ذہن حیوانی ذہن کی ارتقا یافتہ صورت ہے۔

ڈارون نے اپنی کتاب **The Descent of Man** میں ثابت کیا کہ انسانوں اور حیوانوں کی بہت سی ذہنی خصوصیات مشترک ہیں۔ ڈارون نے ثابت کیا کہ انسانوں کی طرح جانور بھی خوش ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے کھیلتے ہیں اور شرارت سے لڑتے ہیں۔ خوشی کی خصاصیات کے ساتھ ساتھ جانور غم کا اظہار بھی کرتے ہیں اور جب انسانوں کی طرح خوفزدہ ہوتے ہیں تو ان کے دل زور زور سے دھڑکنے لگتے ہیں اور ان کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر جانوروں کا کوئی قریبی رشتہ دار فوت ہو جائے تو وہ دکھی بھی ہوتے ہیں۔ جو بندروں کے

بچے یتیم ہو جاتے ہیں انہیں دوسرے بندر پالتے ہیں۔

ڈارون نے یہ بھی ثابت کیا کہ جانور ذہین بھی ہوتے ہیں۔ ایک بندر جس کے دانت کمزور تھے اس نے پتھر سے اخروٹ توڑنا شروع کر دیا تھا۔

جانور انسانوں کی طرح محبت بھی کرتے ہیں۔ کتے اپنے مالک سے بہت وفاداری کرتے ہیں۔ جانوروں کو حسن کا بھی احساس ہوتا ہے۔ مور اور مورنی کا رقص اس کی عمدہ مثال ہے۔

ڈارون کا کہنا تھا کہ جو چیز انسانوں کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی زبان ہے۔ زبان کی وجہ سے ہی انسانوں نے شاعری اور ادب کو فروغ دیا اور سائنس اور ٹکنالوجی، مذہب اور روحانیات کے علوم میں ترقی کی۔

ڈارون کا خیال تھا کہ وہ لوگ جو ذہنی طور پر ارتقا یافتہ نہیں ہیں انہوں نے مذاہب عالم کو بغیر سوچے سمجھے قبول کر رکھا ہے۔ جو ارتقا یافتہ انسان ہیں انہوں نے جدید علوم حاصل کیے ہیں اور پرانی روایات کو چیلنج کرنا شروع کر دیا ہے۔ جو لوگ پرانی روایتوں کو گلے لگائے رکھتے ہیں اور ان پر اندھا ایمان رکھتے ہیں ان سے مذہبی رہنما ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے پیروکاروں سے خدا اور مذہب کے نام پر قربانیاں مانگتے ہیں اور سادہ لوح لوگ قربانیاں دینے لگتے ہیں۔ جو لوگ ارتقا یافتہ ہیں وہ تنقیدی سوچ رکھتے ہیں اور مذہبی روایات کو سائنس، فلسفے اور نفسیات کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ وہ مذہبی کتابوں کی بجائے اپنے انفرادی اور اجتماعی ضمیر کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے بارے میں ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں۔

حیوان اپنی جبلت پر عمل کرتے ہیں لیکن انسانوں کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ جبلت پر عمل کریں یا اپنے ضمیر کی پیروی کریں۔ جوں جوں انسان سائنسی اور منطقی انداز سے سوچنا سیکھ رہے ہیں وہ اپنی زندگی کے بارے میں دانشمندانہ فیصلے کرنے کے قابل ہو رہے ہیں اور اپنے بچوں اور بچیوں کو جدید انداز سے سوچنا سکھا رہے ہیں۔

ڈارون نے جن سائنسی اور سیکولر نظریات کی بنیاد رکھی ان ہی بنیادوں پر سگمنڈ فرائڈ، کارل مارکس اور ژاں پال سارتر جیسے فلسفیوں نے سیکولر نظریات کی اعلیٰ عمارتیں تعمیر کیں۔ ڈارون نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا کہ انسانوں کا ذہن حیوانوں کے ذہن کی ارتقا یافتہ شکل ہے۔

مذہب اور سائنس

تحریر: البرٹ آئن سٹائن، ترجمہ: خالد سہیل

(البرٹ آئن سٹائن [Albert Einstein] کی کتاب Ideals and Opinions کے چند اقتباسات کا ترجمہ اور تلخیص)

(1)

جب ہم انسانی تاریخ میں مذہبی اور روحانی تحریکوں کے ارتقاء کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی وہ کون سی ضروریات تھیں اور وہ کون سے جذبات تھے جن کی تسکین کے لئے انسان نے مذہب کو جنم دیا۔ جب ہم انسانی ارتقاء کے ابتدائی مراحل کو پیش نظر رکھتے ہیں تو ہم اس دور کے انسانوں کو خوف سے نبرد آزما ہوتا دیکھتے ہیں۔ چاہے وہ بھوک کا خوف ہو یا جنگلی جانوروں کا خوف، چاہے وہ بیماری کا خوف ہو یا موت کا خوف۔ اُسے ساری عمر خوف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس دور میں انسانی ذہن نے ابھی اتنی نشوونما نہ پائی تھی کہ وہ زندگی کے مسائل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ سکے اور اپنی دشواریوں کی گتھیوں کو سلجھا سکے۔ چنانچہ اس کے ذہن نے ایسی خیالی ہستیوں کو جنم دیا جن کی ناراضگی مسائل کا پیش خیمہ بنتی اور وہ ان ہستیوں کو خوش رکھنے کے لئے مختلف قسم کی قربانیاں دیتا۔ اس دور کے نظریات اور اقدار نسل در نسل روایات کا حصہ بنتے گئے اور مذہب کا روپ اختیار کرتے گئے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دور کا مذہب خوف کی پیداوار تھا۔

انسانی ارتقاء کے اس دور میں آہستہ آہستہ مذہبی رہنماؤں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جس نے انسانوں کو یقین دلایا کہ وہ اُن کے اور اُن خیالی ہستیوں کے درمیان، جن سے وہ خوفزدہ

رہتے تھے، ایک وسیلے کا کام کر سکتے ہیں۔ اس دور میں بعض سیاسی رہنما اور اصحاب اختیار بھی ان مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مل گئے، کیونکہ ان سب کے مفادات مشترک تھے۔

خوف کے پیدا کردہ مذہب کے ساتھ ساتھ انسانوں کی ایک اور ضرورت نے بھی مذہب کو فروغ دیا اور وہ انسانوں کی اعلیٰ اقدار اور محبت اور اخوت کے اصولوں کی تلاش تھی۔ اس ضرورت نے خدا کے معاشرتی اور اخلاقی تصور کو جنم دیا۔ وہ ایسا خدا تھا جو انسانوں کو تحفظ دیتا تھا۔ اُن کے نیک کاموں کو انعام سے نوازتا اور برے کاموں کی سزا دیتا تھا۔ ایسا خدا انسانوں کے برے وقت میں کام آتا تھا اور انہیں ایک بہتر زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا تھا۔

آسمانی کتابیں ہمیں خوف کے مذہب سے اعلیٰ اقدار اور اخلاقیات کے مذہب کے ارتقاء کی کہانی سناتی ہیں۔ مہذب انسانوں کا مذہب خوف کی بجائے اعلیٰ اقدار کا مذہب ہے اور یہ ارتقاء انسانی ارتقاء کا ترجمان ہے۔ اگرچہ دُنیا کے اکثر مذاہب میں آج بھی دونوں حصے پائے جاتے ہیں، لیکن کوئی معاشرہ جتنا مہذب اور ارتقاء پذیر ہوگا، اُس میں اعلیٰ اقدار کے مذہب کا تناسب اُتنا ہی زیادہ ہوگا۔

انسانی تاریخ میں خدا اور مذہب کے ان دو تصورات کے ساتھ ساتھ ایک تیسرے تصور نے بھی نشوونما پائی ہے، جس سے ہر دور میں صرف چند برگزیدہ انسان ہی آشنا رہے ہیں اور وہ تصور مذہب اور خدا کا ایک کائناتی تصور ہے۔ اس تصور کو بیان کرنا اور ان لوگوں کو سمجھانا، جنہیں اس کا تجربہ نہ ہوا ہو بہت ہی مشکل کام ہے۔ مذہب کے اس تجربے سے انسان اپنی ذات اور کائنات سے ایک نئے رشتے میں جڑ جاتا ہے۔ بدھا اور کئی دیگر پیغمبروں نے اپنی تعلیمات میں اس تجربے کا ذکر کیا ہے۔ انسانی تاریخ میں وہ نابغے اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک انسان، جو اس تجربے سے گزرتے ہیں وہ خدا کے ان تصورات سے بہت آگے نکل آتے ہیں، جنہیں انسان کے محدود ذہن نے تراشا تھا۔ ایسے انسان چونکہ مذہب، خدا اور آسمانی کتابوں کے روایتی تصور کو نہیں مانتے۔ اس لئے بعض لوگ انہیں ملحد قرار دیتے ہیں اور بعض صوفی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذہب کا یہ کائناتی تصور اور تجربہ روایتی مذہب، خدا اور آسمانی کتابوں کو نہیں مانتا تو عام انسان اس تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس تصور اور تجربے کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے کا کام سائنس اور فنونِ لطیفہ کے ذمے ہے۔ یہ دونوں چیزیں انسانوں کے دلوں میں وہ چنگاریاں سلگاتی ہیں، جو مذہب کے اس کائناتی

تجربے کی شمع جلانے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔

اگر ہم ان غیر روایتی خطوط پر سوچیں تو ہماری مذہب اور سائنس کے ایک نئے رشتے تک رسائی ہو جاتی ہے۔ روایتی سوچ کے مطابق مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے مخالف نظر آتے ہیں۔ روایتی سوچ رکھنے والے جب کائنات کے نظام کو قوانین فطرت کا پابند سمجھتے ہیں تو ان کے لئے کسی ایسے خدا کو ماننا مشکل ہو جاتا ہے جو ان قوانین میں دخل اندازی کرتا ہو اور جب چاہے انہیں بدل دیتا ہو۔ ان کے خیال میں ایسے خدا کا تصور جو انعام اور سزا دیتا ہے بالکل بے معنی ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ انسانی اعمال اس کی داخلی اور خارجی ضروریات کا ردِ عمل ہیں۔ ان کی نگاہ میں انسان اپنے اعمال کا کائنات کی دیگر مخلوقات کی طرح جن میں نباتات اور حیوانات بھی شامل ہیں، خدا کی نگاہ میں ذمہ دار نہیں ہے۔

سائنس پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ اخلاقیات کی بنیادیں کمزور کرتی ہے۔ میرے خیال میں یہ اعتراض بے جا ہے۔ انسان کی اخلاقی زندگی کو ہمدردی، تعلیم اور معاشرتی ضروریات کے تابع ہونا چاہیے۔ اگر انسان کی اخلاقی زندگی موت کے بعد کی جزا و سزا پر منحصر ہے تو مجھے یہ بھی کوئی احسن بنیاد نظر نہیں آتی۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ سمجھنا آسان ہے کہ انسانی تاریخ میں مذہب اور سائنس کیوں ایک دوسرے کے مخالف رہے ہیں۔ میری نگاہ میں مذہب کا کائناتی تصور سائنس کی تحقیق کے لئے ایک کامیاب محرک ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر سائنسدانوں کی شخصیت میں اس کائناتی ایمان کا فقدان ہو تو وہ اپنی تحقیقات میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ نیوٹن اور کیپلر نے دُنیاوی زندگی کی بیشتر مالی اور معاشرتی آسائشوں کی قربانی دی اور اپنی تحقیقات پر توجہ مرکوز رکھی۔ ان سائنسدانوں کے لئے اس ایمان کے زادِ راہ کے بغیر سائنس کا تخلیقی اور تحقیقی سفر جاری رکھنا ممکن نہ ہوتا جو لوگ اس قسم کی سائنسی تحقیق میں ملوث نہیں ہیں۔ ان کے لئے شاید متعدد ناکامیوں کے باوجود اس سفر کو جاری رکھنے کا عمل سمجھنا دشوار ہو۔ میری نگاہ میں مذہب کا وہ کائناتی تصور ہی ان سائنسدانوں کو وہ حوصلہ، ہمت اور توانائی بخشتا ہے جو انہیں ان تمام آزمائشوں میں کامیاب کرتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں مادیت کے اس دور میں سائنس کا سنجیدہ کام صرف صحیح معنوں میں روحانی لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

****

(آئن سٹائن کے مضمون Religion and Science کے چند اقتباسات کی تلخیص اور ترجمہ جو New York Times Magazine میں 9 نومبر 1930 کو شائع ہوا تھا۔)

(2)

پچھلی دو صدیوں میں یہ تصور بہت عام تھا کہ علم اور ایمان کے درمیان ایک تضاد پایا جاتا ہے۔ بہت سے اہلِ دانش یہ سمجھتے تھے کہ وہ وقت آ گیا ہے کہ اب ہم ایمان کو آہستہ آہستہ علم سے بدل دیں۔ کیونکہ وہ ایسے ایمان کو جو علم پر مبنی نہ ہو، توہمات میں شمار کرتے تھے اور اس کی مخالفت کرتے تھے۔ ان لوگوں کے خیال میں تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ وہ آزادانہ طور پر سوچنے اور علم حاصل کرنے کے دروازے کھولے۔ لیکن میرے خیال میں یہ دلیل یک طرفہ ہے۔ یہ تو درست ہے کہ ہمیں ان اصولوں پر یقین کرنا چاہیے، جن کی عمارت ہمارے تجربے کی بنیادوں پر کھڑی ہو جو ایک سائنسی نقطۂ نظر ہے لیکن وہ تصورات اور اعتقادات جو ہماری اخلاقی زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں، اُن تک رسائی سائنسی طرزِ عمل سے ممکن نہیں ہے۔

سائنسی طرزِ فکر کا تعلق مادی حقائق اور ان کے باہمی رشتوں سے ہے۔ اس اندازِ فکر نے ہماری کائنات کو سمجھنے میں بہت مدد کی ہے، لیکن اس نے ہمارا اس حقیقت سے بھی تعارف کروایا ہے کہ وہ علم جو ''کیا ہے'' سے تعلق رکھتا ہے، ''کیا ہونا چاہئے'' کے بارے میں ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ زندگی کے حقائق کا علم بہت ضروری اور قیمتی ہے، لیکن وہ علم انسانیت کی رہنمائی کرنے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوتا، کیونکہ سائنسی علم کی اپنی حدود ہیں۔

اس طرزِ استدلال کے یہ معنی نہیں کہ ہماری عقل اور سوچ اخلاقیات کے سلسلے میں ہماری مدد نہیں کر سکتی۔ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ انسانی نفسیات اور اخلاقیات کے اصولوں کے لئے ہمیں مذہب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اگر کوئی یہ سوال پوچھے کہ اگر اخلاقیات کے لئے سائنسی اور عقلی دلائل کافی نہیں ہیں تو پھر ان کا ماخذ کیا ہے تو ہم جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ ایک صحت مند معاشرے میں وہ اصول طاقتور روایات کے طور پر موجود ہوتے ہیں جو انسانوں کے اعمال، ان کے فیصلوں اور ان کے خوابوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ ایسے اصول ہوتے ہیں جن پر اکثریت کا اتفاق الرائے ہوتا ہے اور انہیں ہر قدم پر عقلی دلائل کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ ان اصولوں تک انسان سائنس کی

انسانی شعور کا ارتقا

بجائے عظیم ہستیوں کے روحانی تجربوں کے راستے پہنچتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ ان اصولوں تک رسائی کی ایک روایت یہودیت اور عیسائیت کی آسمانی کتابوں کا سلسلہ رہا ہے۔

اگر کوئی یہ پوچھے کہ مذہبی اصولوں کا مقصد کیا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذاہب کی کوشش یہ رہی ہے کہ انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں کو آزادانہ اور ذمہ دارانہ طور پر بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ مذاہب کا مقصد انسانیت کا ارتقا رہا ہے۔ ان کی روحانی روایات کے مطابق سب انسان ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور روحانی طور پر ایک ہی باپ کی اولاد۔ انسانوں کی روحانی زندگی کا مقصد دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کی بجائے ان کی خدمت کرنا ہے۔ یہ روحانی روایات انسانوں کو ملک اور قوم کی تنگ نظر گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر سوچنے اور زندگی گزارنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ میری نگاہ میں تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ بچے جب جوان ہوں تو وہ ان عالمی برادری کے اصولوں کو اسی طرح اپنی شخصیت میں جذب کر لیں، جیسے وہ تازہ ہوا کو جذب کرتے ہیں۔ اگر ہم ان اصولوں کو پیشِ نظر رکھیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ عہدِ حاضر کے انسان کو شدید خطرے کا سامنا ہے۔ آج کے دور میں بہت سے ممالک ایسے ہیں جن کے ظالم حاکم اور غاصبانہ حکومتیں انسانیت کی روح کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ وہ حکومتیں، ملک اور قوم کے نام پر تنگ نظری کو فروغ دے رہی ہیں۔ وہ حاکم معاشی ذرائع سے انسانوں کا اور عالمی برادری کی قیمتی روایات کا استحصال کر رہے ہیں۔

ہمارے دور کے جو ذی شعور انسان ہیں ان میں انسانیت کے مستقبل کے بارے میں تشویش بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے بزرگ دانائی کی چند ایسی باتوں سے واقف تھے، جنہیں ہم فراموش کر چکے ہیں۔ ہمارے بزرگ جانتے تھے کہ زندگی میں کامیابی کے لئے خلوص بہت ضروری ہے۔ جب تک ہماری نیتیں نیک نہیں ہوں گی، اس وقت تک ہم مثبت نتائج تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوں گے اور ہمارے خیالات نیک اعمال کا روپ نہیں دھار سکیں گے۔

****

(آئن سٹائن کی 1939ء میں **Princeton Theological Seminary** اور 1941ء میں **Science, Religion and Philosphy** کے موضوع پر تقاریر کے چند اقتباسات کا ترجمہ اور تلخیص)

(3)

اگر کوئی یہ سوال پوچھے کہ سائنس کیا ہے؟ تو شاید ہم سب اس بات پر اتفاق کریں کہ سائنس تقریباً ایک صدی پرانی انسانی کاوش ہے جس میں اس کائنات کے بارے میں ایک منظم علم تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس علم میں زندگی کو سمجھنے کے لئے ایسا تصوراتی ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے، جس کی بنیاد انسانی تجربے اور دلیل پر رکھی گئی ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ سوال پوچھے کہ مذہب کیا ہے؟ تو شاید ہم اس سوال کا اتنی آسانی سے جواب نہ دے سکیں۔ جن ہستیوں نے اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کیا ہے وہ بھی اس موضوع پر اتفاق الرائے نہیں رکھتیں۔

میرا خیال ہے کہ بجائے یہ سوال پوچھنے کے کہ مذہب کیا ہے؟ شاید اس سوال کا جواب دینا آسان ہو کہ وہ لوگ جو مذہبی کہلاتے ہیں، اُن کے مقاصد اور خواب کیا ہیں۔ میری نگاہ میں وہ لوگ جو مذہبی بصیرتوں کے مالک ہیں، ایسے انسان ہیں جو اپنی خودغرضانہ ضروریات سے بالاتر ہو کر بنی نوع انسان کی فلاح کے بارے میں غور کرتے رہتے ہیں، ان کے پیشِ نظر پوری انسانیت کی بہتری ہوتی ہے۔ کسی شخص کے مذہبی ہونے کے لئے ان روحانی مقاصد اور آدرشوں کے ساتھ ساتھ کسی خالق یا خدا کا تصور لازمی نہیں ہوتا ورنہ ہم بدھا اور سپنوزا (Spinoza) جیسی ہستیوں کو مذہبی نہ کہہ سکیں گے۔ ایک مذہبی انسان کے لئے ان اصولوں پر ایمان لانے کے لئے عقلی دلائل ضروری نہیں ہوتے۔ اس حوالے سے مذہب، نسل در نسل منتقل ہونے والی ایسی روایات کا نام ہے، جن کا مقصد انسانوں کو ایسے اقدار دینا ہے جن سے ان کی زندگیاں ارتقاپذیر رہیں اور وہ ایک بہتر زندگی گزارنے کی جستجو جاری رکھ سکیں۔

اگر ہم سائنس اور مذہب کے بارے میں ان خطوط پر سوچیں تو ان کے درمیان تضاد کی گنجائش نہیں رہتی۔ سائنس کا تعلق ایسے علم سے ہے جو کائنات میں جو ہے (What is) اس کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مذہب کا تعلق ایسی اقدار سے ہے جو کیا ہونا چاہئے (What should be) کو احاطہ کرنا چاہتا ہے۔ ماضی میں سائنس اور مذہب میں اس وقت تضادات ابھرے ہیں۔ جب انہوں نے اپنے اپنے دائروں سے باہر قدم رکھا ہے۔ جب سائنس نے مذہبی اور اخلاقی اقدار کے دائرے میں اور مذہب نے فطری حقائق کے دائرے میں داخل ہونا چاہا تو بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ مثال کے طور پر جب کوئی مذہبی گروہ اس بات پر

اصرار کرتا ہے کہ بائبل میں جو بیانات دیے گئے ہیں وہ آخری حقیقت ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ مذہب سائنسی تحقیق کے نتائج کو ماننے سے انکار کر رہا ہے۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جب گرجوں اور گلیلیو اور ڈارون کی تحقیقات میں تصادم پیدا ہوا۔ اس کے مقابلے میں جب سائنس کے نمائندوں نے اخلاقی اقدار کے معاملات میں دخل اندازی کرنی شروع کی تو انہیں بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تضادات نے ماضی میں انسانی زندگی کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

اگرچہ مذہب اور سائنس کے دائرے ایک دوسرے سے کافی جدا ہیں، لیکن پھر بھی انہیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ مذہب کا تعلق انسانی زندگی کو اعلیٰ اقدار دینا ہے، لیکن اسے سائنسدانوں کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ سائنسدان اپنی تحقیق سے زندگی کے پردے اٹھاتے ہیں اور مذہب کے پیش کردہ نظریات کو ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح سائنسدانوں کو اپنی تحقیق میں کامیاب ہونے کے لئے ایسے مذہبی اور روحانی جذبے کی ضرورت پڑتی ہے، جو انہیں مشکلات کا سامنا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس طرح مذہب اور سائنس ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ میرے خیال میں مذہب کے بغیر سائنس لنگڑی ہے اور سائنس کے بغیر مذہب اندھا ہے۔

جب میں نے یہ کہا تھا کہ سائنس اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں ہے تو میرے پیشِ نظر روایتی مذاہب کے نظریات تھے۔ اس نقطۂ نظر کا اطلاق خدا کے تصور پر نہیں ہوتا۔

انسانوں نے اپنے ارتقاء کے ابتدائی دور میں اپنے ذہن میں ایسے خداؤں کا تصور پیدا کیا جو نظامِ فطرت کو چلاتے تھے۔ ان انسانوں نے ان خداؤں کو قربانیاں بھی دیں اور دُعا اور جادو سے رام بھی کرنا چاہا تاکہ وہ انسانوں کو انعامات سے نوازیں۔ آہستہ آہستہ ان خداؤں کے تصور نے ایک خدا کا روپ دھارا اور انسان آج بھی اس ایک ہستی کو اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے پکارتا ہے۔ اگرچہ خدا کا یہ تصور عوام و خواص کو ایک خاص طرح کا سکون پہنچاتا ہے اور رہنمائی بخشتا ہے اور اپنی سادگی کی وجہ سے سادہ لوح انسانوں میں بھی مقبول ہے لیکن خدا کے اس تصور نے بہت سے مسائل بھی پیدا کئے ہیں۔ اگر خدا نے کائنات کی ہر چیز کو اپنی مرضی سے تخلیق کیا ہے اور کائنات کا کوئی ذرہ اس کی مرضی کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا تو انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار کیسے بن گئے اور جب خدا انہیں جزا و سزا دیتا ہے تو کیا وہ

خود اپنی عدالت میں کھڑا نہیں ہوتا۔

سائنس اور مذہب کا تضاد اس وقت شروع ہوتا ہے، جب ہم ایک ذاتی خدا کی بات کرتے ہیں۔

سائنس کا کام ایسے قوانین کی تلاش ہے جن کی بنیاد پر ہم انسانی زندگی کا کائنات کو اپنی عقل اور شعور کے حوالے سے سمجھ سکیں اور اس حوالے سے سائنس نے اجرامِ فلکی برقی رو کے عمل اور کئی دیگر شعبوں میں بہت سی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہم اکثر اوقات چند دن پہلے موسم کا حال بھی جان لیتے ہیں اور اگر نہیں جان سکتے تو اس کی وجہ وہ عوامل ہوتے ہیں جو بدلتے رہتے ہیں نہ کہ یہ کہ سائنس کا علم کمزور ہے۔

ایک سائنسدان کی نگاہ میں فطرت انسانی خواہشات سے بے نیاز اپنے مخصوص قوانین اور اصولوں کی تابع ہے۔ ویسے تو سائنس کبھی حتماً ثابت نہیں کر سکتی کہ ایک ذاتی خدا قوانین کو نہیں بدل سکتا لیکن یہ تصور صرف ان علاقوں میں ہی پناہ تلاش کر سکتا ہے جہاں ابھی سائنس نے قدم نہیں رکھا۔

میری نگاہ میں مذہب کے رہنماؤں کو اب ایک ذاتی خدا کے تصور کو خیرباد کہہ کر ان قوانین، اصولوں اور اخلاقیات پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے جو انسانوں میں نیکی، خیر حسن اور سچائی کے جذبوں کو جلا بخشتے ہیں۔ اگر انہوں نے یہ رویہ اختیار کیا تو انہیں اندازہ ہوگا کہ سائنسی علم کس طرح ان کی مخالفت کی بجائے ان کے تعاون کے لئے حاضر ہوگا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مذہب اور سائنس گلے مل جائیں گے اور انسانی ارتقاء میں ممد ومعاون ثابت ہوں گے کیونکہ سائنس اپنا ایک روحانی پہلو بھی رکھتی ہے۔

جب ہم انسانی ارتقا کے روحانی پہلو پر توجہ مرکوز کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ عصری مذہب زندگی اور موت کے خوف اور اندھے ایمان سے بہت آگے نکل آیا ہے۔ اب وہ عقلی دلائل کو گلے لگاتا ہے۔ یہ مقام ہے جہاں سائنس اپنے روحانی عنصر اور مذہب اپنے عقلی دلائل پر ناز کرتے ہیں، وہاں پادری ایک معلم کا اور سائنسدان ایک صوفی کا روپ دھار لیتا ہے۔

****

آئن سٹائن کے مضمون: **Religion and Scence: Irreconcilable?** کے چند اقتباسات کی تلخیص اور ترجمہ جو 1948ء میں **The Christian Register** میں چھپا تھا۔)

مذہب اور سائنس

تخلیق: خالد سہیل

ایک مذہبی خاندان اور روایتی ثقافت میں پرورش پانے کی وجہ سے جب میری ملاقات سائنس سے ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو ایک دوراہے پر کھڑا پایا۔ سائنسی فکر اور اندھے ایمان کا تضاد اس وقت اپنی معراج پر پہنچا جب میں میڈیکل کالج میں داخل ہوا اور میں نے طب کا مطالعہ شروع کیا۔ مجھے اس وقت احساس ہوا کہ سائنس صرف چند حقائق اور معلومات کو جمع کرنے کا نام نہیں بلکہ ایک نقطۂ نظر، ایک اندازِ فکر اور ایک فلسفۂ حیات کا نام ہے لیکن وہ فلسفہ میرے اندھے ایمان سے مختلف ہی نہیں متضاد بھی تھا۔ اس سائنسی نقطۂ نظر نے میرے اعتقادات کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔

ایک روایتی مسلمان ہونے کے ناطے میں ایک خدا، مذہب، پیغمبروں، آسمانی کتابوں اور موت بعد الحیات پر ایمان رکھتا تھا۔ سائنس نے مجھے منطقی انداز میں سوچنے کی دعوت دی اور مجھے اندازہ ہوا کہ سائنس کی تحقیقات، مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہیں آسمانی کتابوں پر نہیں۔ سائنسدان خوردبین اور دوربین سے کائنات کا مشاہدہ اور تجزیہ کرتے ہیں اور کائنات اور زندگی کے اسرار و رموز کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بزرگوں کی روایتوں اور کہاوتوں پر اندھا ایمان نہیں لاتے۔

سائنس اور مذہب کی تعلیمات کے تضاد نے میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل پیدا کر دی اور میں اس تضاد کو کافی عرصے تک حل نہ کر سکا۔ اس تضاد نے ایک عرصے تک میری راتوں کی نیند اڑا دی تھی اور میں ایک شدید ذہنی اور جذباتی بحران سے گزر رہا تھا۔

اس بحران کا ایک المیہ یہ تھا کہ میرے سائنس کے اساتذہ مذہبی کتابوں کی تعلیمات سے نابلد تھے اور مذہبی علماء سائنس کی جدید تحقیقات سے ناواقف۔ مجھے یوں لگا جیسے سائنس اور

مذہب دریا کے دو کنارے ہوں جن پر نہ کوئی پل تھا اور نہ ہی اس معاشرے میں ان دو کناروں کے ملنے کے کوئی امکانات تھے۔ جب میرے سائنس کے اساتذہ اور وہ مذہبی علماء' جنھیں میں جانتا تھا' میری کوئی مدد نہ کر سکے تو میں نے لائبریری کا رخ کیا اور اپنے تضاد کو حل کرنے کے لئے مذہبی علماء اور دانشوروں کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس تحقیق اور سچ کی تلاش میں جن بزرگوں کی تعلیمات سے میں نے استفادہ کیا ان میں سرِ فہرست ابوالاعلیٰ مودودی' غلام احمد پرویز' محمد اقبال اور ابوالکلام آزاد تھے۔ ان علماء نے زندگی کے مختلف موضوعات پر سیر حاصل بحث کی تھی۔ ان بزرگوں کی کتابیں پڑھتے ہوئے مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود میں عربی زبان سے ناواقف تھا۔ چونکہ میں قرآن و حدیث کا بلا واسطہ عربی میں مطالعہ نہ کر سکتا تھا اس لئے میں نے ان کے تراجم پڑھنے شروع کر دئے۔

میرا سب سے بڑا مسئلہ وہ خدا کا تصور تھا جو قادرِ مطلق تھا اور جس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہ ہلتا تھا۔ میں تو کرامات اور معجزوں کو ماننے والا تھا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب مقامی عیدگاہ میں سینکڑوں مسلمان نماز پڑھنے جمع ہوئے تھے تاکہ بارش کی دعا مانگ سکیں۔ ان ہی دنوں سائنس مجھے یہ سکھا رہی تھی کہ بارش کا نمازوں سے کوئی تعلق نہیں بارش تو قوانینِ فطرت کے مطابق ہوتی ہے اور وہ قوانین دعاؤں سے نہیں بدلتے۔ اسلام کی تعلیمات کے مطابق خدا نے فرشتے مقرر کر رکھے تھے جو فطرت کا نظام چلا رہے تھے اور ان کی مختلف ذمہ داریاں تھیں:

جبرائیل وحی لانے کے لئے تھا

میکائیل بادلوں اور ہواؤں کا ذمہ دار تھا

عزرائیل موت کا فرشتہ تھا اور

اسرافیل قیامت کے دن صور پھونکنے کے لئے تھا

سائنس کے طالبعلم ہونے کے ناطے میرے لئے ان فرشتوں اور معجزوں پر ایمان لانا مشکل تھا۔ سائنس کا کہنا تھا کہ ہوائیں اور بادل' دن اور رات' سورج اور چاند گرہن سائنسی قوانین کے تحت وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ مجھے اس دن بہت خوشی ہوئی تھی جس دن میں نے غلام احمد پرویز کی کتاب مفہوم القرآن پڑھی تھی جس میں انہوں نے ملائکہ کا ترجمہ فرشتے

کرنے کی بجائے قوانینِ فطرت کیا تھا۔ پرویز کی خواہش تھی کہ قرآن اور اسلام کو منطقی انداز سے پیش کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم زندگی کو تین حصوں میں بانٹ سکتے ہیں

ا۔ موافقِ عقل۔ یہ وہ واقعات جو عقلی دلائل اور منطقی انداز سے سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کا تعلق سائنسی دنیا سے ہے۔

ب۔ خلافِ عقل۔ یہ وہ واقعات ہیں جو عقل کی تردید کرتے ہیں

ج۔ بالائے عقل۔ یہ وہ واقعات ہیں جو منطقی انداز سے نہ تو سچ ثابت کئے جا سکتے ہیں نہ جھوٹ۔ پرویز کا کہنا تھا کہ مذہب کی بہت سی تعلیمات جن میں خدا کا وجود اور حیات بعد الموت شامل ہیں خلافِ عقل نہیں بالائے عقل ہیں۔ اس کے مقابلے میں عیسیٰ کا بغیر باپ کے پیدا ہونا بالائے عقل نہیں خلافِ عقل ہے۔ پرویز خلافِ عقل کرامات اور معجزوں پر ایمان نہ رکھتے تھے۔

جب میں نے علامہ اقبال کے چھ خطبات پڑھے تو مجھے پتہ چلا کہ انھوں نے قرآن کی علامتی ا:ر استعاراتی تفسیر پر زور دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جنت اور دوزخ ذہنی کیفیتیں states ہیں جگہیں places نہیں۔ ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ قرآن کی آدم اور حوا کی کہانی ہر مرد اور عورت کی علامتی کہانی ہے نہ کہ کسی خاص مرد اور عورت کی کہانی جو جنت میں پیدا ہوئے تھے۔ اقبال کے خطبات پڑھنے کے بعد میں نے آسمانی کتابوں کو لوک ورثہ folklore کے طور پر پڑھنا شروع کر دیا۔ ایسا کرنے سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ سائنس اور مذہب کے تضاد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگ قرآن اور آسمانی کتابوں کا لغوی ترجمہ کرتے تھے استعاراتی نہیں۔

سائنس اور طب کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں ڈارون کے نظریے سے بہت متاثر ہوا جنھوں نے زندگی کے ارتقا کو سائنسی انداز سے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے یہ پڑھ کر حیرانی ہوئی کہ ابوالاعلیٰ مودودی جیسے جید عالم بھی ڈارون کے نظریے theory of evolution کو نہ مانتے تھے۔ وہ جنت میں آدم اور حوا کی تخلیق کے نظریے theory of creation پر ایمان رکھتے تھے۔ ابوالکلام آزاد وہ واحد مسلم دانشور تھے جو ڈارون کے نظریے اور قرآن میں کوئی تضاد نہ پاتے تھے۔ انھوں نے اپنی قرآن کی تفسیر ترجمان القرآن میں اس تضاد کو اس طرح حل کیا تھا کہ انھوں نے 'نفس الواحدہ' کا روایتی ترجمہ آدم کرنے کی بجائے امیبا کا خلیہ

unicellular organism کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآن میں زندگی کی ابتدا سمندر سے ہوئی ہے اور پھر ارتقا کے مختلف مراحل طے کر کے زمین پر آئی اور پھر انسان تک پہنچی۔ آزاد کا کہنا تھا کہ اگر ہم شکمِ مادر میں بچے کی پرورش کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں تو ہمیں ہزاروں سالوں کے ارتقا کے تمام مراحل کی جھلکیاں نو مہینے کے سفر میں نظر آ جائیں گی۔ طب کے طالبعلم ہونے کے ناطے میں آزاد کی قرآن کی تفسیر پڑھ کر بہت متاثر ہوا تھا۔

مودودی، پرویز، اقبال اور آزاد کی کتابوں کے مطالعہ کا مجھے فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ ہوا کہ مجھے احساس ہو گیا کہ ہم قرآن کا استعاراتی مطالعہ بھی کر سکتے ہیں تا کہ اس میں اور سائنس میں کوئی تضاد نہ رہے۔ نقصان یہ ہوا کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ قرآن کا ہر مفسر اس کی جداگانہ تفسیر کرتا ہے اور کوئی دو عالم اور مفسر ایک بات پر متفق نہیں ہوتے۔ مجھے احساس ہو گیا کہ میرے لئے قرآن کا اصل مطلب اور تفسیر جاننا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے قرآن سینکڑوں سال پیشتر کی ثقافت کی ترجمانی کرتا ہو جسے مختلف ادوار میں مختلف انسانوں اور گروہوں نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہو اور اپنے مطلب کی تفسیریں کی ہوں۔ اس مطالعے کے بعد میں نے قرآن کو حکیمانہ ادب wisdom literature کا حصہ سمجھنا شروع کر دیا اور اس سے زندگی کے قوانین نکالنا چھوڑ دیا۔

مسلم دانشوروں کی کتابیں پڑھنے کے بعد میں نے دیگر مذاہب کے علماء کی تخلیقات پڑھنی شروع کر دیں۔ ان تمام دانشوروں میں سے جن کا میں نے مطالعہ کیا میں یہاں صرف دو کا ذکر کروں گا کیونکہ انہوں نے میری سوچ کا کافی متاثر کیا تھا۔ پہلے مفکر برٹنڈ رسل تھے جن کی کتاب 'میں عیسائی کیوں نہیں ہوں؟' ایک اہم دستاویز تھی۔ رسل ایک دہریہ تھے اور تمام مذاہب کو انسانی ارتقا کے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔ انہوں نے ببانگِ دہل اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کیا تھا 'میری نگاہ میں تمام مذاہب جھوٹے اور خطرناک ہیں۔ یہ بات ہر عقلمند انسان کو سمجھ آ جانی چاہئے کہ چونکہ وہ سب ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں اس لئے درست نہیں ہو سکتے'۔ رسل کے خیالات نے شروع میں میرے نظریات اور اعتقادات کو ایک دھچکہ پہنچایا تھا۔ وہ تمام مذاہب اور ان کی تعلیمات پر معترض تھے۔ انہوں نے ایک ایسے خدا کے تصور کے اعتقاد پر جو ہر جگہ موجود ہے اور ہر چیز کا خالق و مالک ہے' ان الفاظ میں اعتراض

کیا تھا 'اگر آپ کو وہ تمام طاقتیں دے دی جائیں جو کائنات کے خالق و مالک کے پاس موجود ہیں اور لاکھوں سالوں کا عرصہ دے دیا جائے تو کیا آپ کے شہکار کو ککلس کلین (ku klux klan) اور فاشسٹ (fascist) ہوں گے۔' (حوالہ 1)

رسل کا خیال تھا کہ مذاہب نہ صرف انسانیت کی راہ میں رکاوٹ بنے ہیں بلکہ ان کی وجہ سے دنیا میں بہت سی جنگیں بھی برپا ہوئی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مذہب کے نام پر بہت سے مظالم ڈھائے گئے ہیں اور بہت سے انسانوں کا خون بہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں 'اس دور میں جب لوگ عیسائیت پر ایمان رکھتے تھے خدا اور مذہب کو نہ ماننے والوں پر مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ عورتوں کو چڑیلیں سمجھ کر زندہ جلایا جاتا تھا۔ عیسائیت نے گرجا تعمیر کر کے اتنی طاقت حاصل کر لی ہے کہ وہ عوام کی زندگی کی ترقی میں رکاوٹیں کھڑی کرتی رہی ہے'۔ (حوالہ 1)

رسل نہ صرف خدا اور مذہب کے خلاف تھے بلکہ عیسیٰ کے بھی حق میں نہ تھے کیونکہ عیسیٰ اپنے پیغام کو نہ ماننے والوں کو جہنم کے عذاب سے ڈراتے تھے۔ رسل کا کہنا تھا کہ ایک مہربان رہنما انسانوں میں کیسے خوف پھیلا سکتا ہے۔ رسل عیسیٰ کے مقابلے میں سقراط اور بدھا کا زیادہ احترام کرتے تھے کیونکہ بدھا اور سقراط جہنم کی باتیں نہ کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں 'عیسیٰ کے کردار میں ایک اخلاقی کمی ہے اور وہ یہ کہ وہ جہنم پر ایمان رکھتے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی رحم دل شخص ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب پر ایمان رکھ سکتا ہے۔ جب ہم توریت کا مطالعہ کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ عیسیٰ ان لوگوں پر سانپ اور بچھو کہہ کر لعنت بھیجتے تھے جو ان کی تعلیمات کو قبول نہ کرتے تھے۔ میرا نہیں خیال کہ ایک شفیق اور مہربان رہنما انسانوں کے ذہن میں خوف پیدا کرتا ہے'(حوالہ 1)

رسل کا مذاہب عالم پر عمل کرنے والوں اور ان کی حکومتوں پر ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ بچوں کے ذہنوں کو منفی انداز سے متاثر کرتے ہیں۔ مذہبی ادارے انسانی بچوں کی ذہنی نشوونما میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں کیونکہ وہ انہیں منطقی اور عقلی دلائل کی بجائے اندھے ایمان کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں 'تمام مذاہب میں یہ قدر مشترک ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو ایسے عقائد پر ایمان لانے کو کہتے ہیں جو تحقیق سے ثابت نہیں ہوتے۔ اس طرح بچوں کے ذہنوں میں ان لوگوں کے بارے میں غصہ، نفرت اور تلخی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو ان کے

مذہب یا تمام مذاہب کی شدت پسندی کو نہیں مانتے‘۔

رسل جو مذہبی تعصب کے خلاف بغاوت کرتے رہے خود ہی مذہبی تعصب کا شکار ہو گئے۔ جب انہوں نے نیویارک میں ریاضی کے پروفیسر بننے کی درخواست دی تو پادریوں نے ان کی یہ کہہ کر بہت مخالفت کی کہ وہ مذہب اور اخلاقیات کے دشمن ہیں اور نوجوانوں کو جنسی بے راہ روی سکھاتے ہیں۔ اس طرح رسل خود مذہب کی شدت پسندی اور تعصب کا نشانہ بنے۔ اگرچہ ان کے فلسفیانہ نظریات کا ریاضی کے پروفیسر ہونے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ نیویارک میں وقوع پذیر ہوا جس کے باہر آزادی کا مجسمہ statue of liberty ایستادہ ہے اور جسے آزادیِ افکار و گفتار پر فخر حاصل ہے۔

رسل کی کتابوں کے بعد جس دوسرے مفکر نے مجھے متاثر کیا وہ سگمنڈ فرائڈ تھے۔ رسل کا تعلق عیسائی خاندان سے تھا جبکہ فرائڈ ایک یہودی ماحول میں پلے بڑھے تھے۔ وہ بھی مذہبی تعلیمات کے خلاف تھے اور مذہب عالم کو ایک سراب سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ’مذہبی تعلیمات صدیوں کی روایات پر مبنی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ مذہب کو ماننے والے ایسے اعتقادات پر ایمان رکھتے ہیں جن کا ان کے مشاہدے اور تجربے سے دور پار کا بھی واسطہ نہیں ہوتا‘ (حوالہ 2)

فرائڈ کا خیال تھا کہ مذہب انسانیت کے لئے دماغ کا خلل ہے۔ universal obsessional neurosis of humanity رسل کی طرح فرائڈ کا بھی خیال تھا کہ مذہب انسانی ذہن کو اتنا بری طرح متاثر کر دیتا ہے کہ وہ عقل اور منطق کی بجائے اندھے ایمان کی پیروی کرنے لگتا ہے اور جب اس اندھے ایمان کا سائنسی تحقیقات سے سامنا ہوتا ہے تو وہ ایک تضاد کا شکار ہو جاتا ہے۔ فرائڈ لکھتے ہیں ’جب ہم مذہبی لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ وہ مذہبی اعتقادات پر کیوں ایمان لاتے ہیں تو وہ تین وجوہات پیش کرتے ہیں

... ہمارے بزرگ ان پر ایمان رکھتے ہیں

... سینکڑوں سالوں سے ان عقائد کے حق میں دلیلیں دی گئی ہیں

... ان پر اعتراض کرنا ممنوع ہے

ماضی میں ان اعتقادات پر اعتراض کرنے والوں کو بہت سی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا

تھا‘ (حوالہ 2)

فرائڈ کا خیال تھا کہ جوں جوں سائنس کی سرحدیں پھیلتی جائیں گی مذہب کی سرحدیں سکڑتی جائیں گی۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب کا تعلق انسانیت کے ماضی سے ہے جبکہ سائنس کا تعلق انسانیت کے مستقبل سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں ’سائنس ہمیں زندگی کے بارے میں ایک بہتر نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔ جوں جوں سائنس کی تعلیمات عام ہوتی جائیں گی مذہب کے اثرات کم ہوتے جائیں گے۔ شروع میں لوگ مذہب کے فروعی اعتقادات کو شک کی نگاہ سے دیکھیں گے اور پھر اسکی بنیادوں سے بھی منکر ہو جائیں گے‘۔ (حوالہ 2)

سائنس اور فلسفے کے مطالعہ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میری پاکستان کے جس روایتی اور مذہبی ماحول میں تربیت ہوئی تھی وہاں لوگوں کی پرورش ایسے توہمات اور اعتقادات میں ہوئی تھی کہ جب انہیں زندگی کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ انہیں عقل اور منطق سے حل کرنے کی بجائے دعاؤں اور گنڈے تعویز سے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ میڈیکل کالج اور ہسپتال میں میری کئی ایسی عورتوں سے ملاقات ہوئی جو بچہ نہ پیدا ہونے کا طبی علاج کرانے کی بجائے مزاروں پر جا کر کالے بکرے ذبح کرتی رہیں جس سے انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا بعد میں جب ان کی infertility کا طبی علاج کیا گیا تو وہ صحتمند ہو گئیں اور ماں بن گئیں۔ بعض میں تعلیم کی اتنی کمی تھی کہ انہیں عورتوں کے جسم کی کارکردگی physiology کی بالکل معلومات نہ تھیں۔ مجھے آہستہ آہستہ احساس ہونے لگا کہ اگر عوام میں سائنسی تعلیم عام کی جائے تو وہ اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا بہتر حل تلاش کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں سکول‘ کالج اور یونیورسٹیاں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں تا کہ اساتذہ اور والدین بچوں کو فلسفے اور سائنس کی تعلیم دے سکیں۔

مغربی مفکرین کی تخلیقات پڑھنے کے بعد میں نے فلسفہ‘ سائنس اور مذہب کے موضوعات پر لاطینی امریکہ اور افریقی دانشوروں کی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ مجھے افریقی ادیب وول سوئنکا Wole Soyinka کی اسلام اور عیسائیت کے خلاف غصے بھری تحریریں پڑھ کر حیرانی ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ افریقی قوموں کو یورپ اور مشرق وسطی نے معاشی‘ سیاسی اور مذہبی زنجیروں سے غلام بنانے کی کوشش کی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ افریقی عوام ان خا

اثرات سے نجات حاصل کریں اور اپنی افریقی شناخت کو دوبارہ دریافت کریں تاکہ وہ ذہنی' تخلیقی اور روحانی طور پر آزادی وخودمختاری حاصل کر سکیں۔ وہ لکھتے ہیں 'افریقی قوم کے دو دشمن ہیں۔ یورپی استعماریت اور عرب اسلامی جارحیت' ان دونوں نے ہماری آزادی پر حملہ کیا اور ہمیں غلام بنانے کی کوشش کی۔ تیسری دنیا کی مفلوک الحال قومیں کبھی سوشلزم کی محکوم رہیں کبھی سرمایہ داری کی' کبھی اسلام نے انہیں مغلوب کرنے کی کوشش کی کبھی عیسائیت نے۔ دونوں معاشی اور مذہبی روایتوں نے افریقی قوم کا حتی المقدور استحصال کرنے کی کوشش کی۔' (حوالہ 3)

وول سوئنکا اپنی قوم کے افراد سے یہ چبھتا ہوا سوال کرتے ہیں۔ 'کیا ہم مستقبل میں بھی ان یورپی اور عرب' عیسائی اور مسلم' استعماری روایتوں کے محکوم رہیں گے یا اپنی آزادی اور خود مختاری حاصل کرنے کی کوشش کریں گے؟'۔ (حوالہ 3) وول سوئنکا کی تحریروں سے پہلے میں نے کسی ادیب کو اسلام کو ایک استعماری طاقت کے طور پر پیش کرتے نہ دیکھا تھا۔

وول سائنکا کی تخلیقات کے بعد میں نے میکسیکو کے نامور ادیب اوکتاویو پاز کو پڑھنا شروع کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کئی سال شمالی امریکہ' یورپ اور ہندوستان میں گزارے تھے اور عالمی روایات کا تجزیہ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ عیسائیت اور اسلام دونوں روایات میں سائنس اور مذہب کی جنگ جاری رہی تھی فرق یہ تھا کہ عیسائی دنیا میں خدا ہار گیا تھا اور سائنس اور فلسفہ جیت گئے تھے اور نیٹشے نے اعلان کر دیا تھا 'خدا مر چکا ہے God is dead' لیکن اسلامی دنیا میں خدا جیت گیا تھا اور فلسفہ اور سائنس ہار گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں 'اسلام نے بھی عیسائیت کی طرح مذہب اور سائنس کا تضاد دیکھا ہے۔ اس روایت میں غزالی اور فارابی کی تحریریں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ مسلم دنیا میں بھی خدا اور فلسفے کی جنگ موت تک لڑی گئی۔ اگر مسلمانوں میں بھی نیٹشے جیسا فلاسفر ہوتا تو وہ لکھتا 'فلسفہ مر چکا ہے ہم نے اسے قتل کر دیا ہے تم نے بھی اسے قتل کیا ہے اور میں نے بھی اسے قتل کیا ہے' (حوالہ 4)

پاز کو پڑھنے کے بعد میں دوبارہ مسلم دانشوروں کی تحریروں کی طرف لوٹا اور پرویز ہودبھائی کی کتاب 'اسلام اور سائنس' (حوالہ 5) پڑھی۔ اس کتاب میں مسلمانوں میں سائنسی روایات کے عروج و زوال کی کہانی سنائی گئی ہے۔ ہودبھائی کا خیال ہے کہ اسلامی دنیا میں سائنس کو مذہب کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔

جب ہم مسلمانوں کی دنیا میں سائنس اور طب کی تاریخ پڑھتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے بھی ایک سنہرا دور دیکھا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان دانشوروں نے یونانی فلاسفروں کی تحریروں کے عربی میں ترجمے کئے تھے۔ نویں سے گیارہویں صدی کے دوران الرازی' ابن عباس اور ابن سینا جیسے فلاسفر اور دانشور پیدا ہوئے تھے جن کی کتابیں مغربی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ابن سینا کی طب کی کتاب گیارھویں سے سترھویں صدی تک مغربی دنیا کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل تھی۔

ہودبھائی اپنی کتاب میں ان سماجی' معاشی اور مذہبی عوامل کا ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے مسلم دنیا میں سائنس اور فلسفے نے ترقی کی بجائے تنزل کی راہ اختیار کی۔ یہ کہانی کسی بھی مسلمان کو افسردہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں 'تقریباً سات سو سال پیشتر مسلمانوں میں سائنس میں ترقی کرنے کا حوصلہ ختم ہو گیا۔ سوائے چند ایک مستثنیات کے۔ بہت سے روشن خیال مسلمانوں کو اس بات کا دکھ ہے لیکن روایتی مسلمان اس حقیقت سے خوش ہیں کیونکہ ان کے خیال میں مغرب کی سائنس اور سیکولر سوچ اسلام کے لئے ایک خطرہ ہے' (حوالہ 5)

ہودبھائی نے اپنی کتاب میں غزالی کی تخلیقات کے منفی اثرات کا ذکر کیا ہے۔ غزالی نے زندگی کے آخر میں مذہبی ایمان کو گلے لگا کر فلسفے اور ریاضی کی منطقی سوچ کو رد کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا 'ریاضی اور سائنس پڑھنے کا نقصان یہ ہے کہ اس کو پڑھنے والا خدا' مذہب اور آسمانی کتابوں کو رد کرنے لگتا ہے اس طرح اس کے دل میں وحی کے خلاف نفرت پیدا ہو جاتی ہے'۔

ہودبھائی کی تحریروں نے میرا تعارف پروفیسر عبدالسلام کی تخلیقات سے کروایا۔ عبدالسلام نے مذہب اور سائنس کے درمیان ایک پل تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ دونوں جداگانہ روایات ہیں اور وہ ان دونوں روایات میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ لکھتے ہیں ''مجھے اپنے مذہبی اعتقادات اور سائنسی نظریات میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ میرے مذہبی اعتقادات میری صدیوں کی روایات کی میراث ہیں جن کے بارے میں سائنس خاموش ہے۔'' (حوالہ 9)

میرے لئے یہ دلچسپی کی بات تھی کہ سلام اور وائنبرگ دونوں کو سائنس کا نوبل انعام ملا تھا۔ ان کی تحقیقات بیسویں صدی کی سائنس کا ایک روشن باب تھیں۔ سائنس کی دنیا میں دونوں سائنسدان شانہ بہ شانہ کھڑے تھے جبکہ مذہب کی دنیا میں ان میں سینکڑوں سالوں کا بُعد

تھا۔عبدالسلام اسلام کی روایت سے جڑے ہوئے تھے جبکہ وائنبرگ ایک انسان دوست دہریہ تھے جن کے خیال میں اس کائنات کا کوئی داخلی اور آسمانی مقصد نہیں ہر شخص اپنی مرضی سے زندگی میں معنی پیدا کرسکتا ہے۔ان دونوں سائنسدان فلسفیوں نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کردی تھی کہ سائنسی دنیا میں سائنسی تحقیقات اہم ہیں ذاتی اعتقادات نہیں۔

جوں جوں میرے علم میں وسعت پیدا ہوتی گئی مجھے اندازہ ہونے لگا کہ مشرق ومغرب میں ایسے دانشور اور مفکرین بھی ہیں جو سائنس اور مذہب کی دنیاؤں میں ایک پل تعمیر کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ بیسویں صدی کی سائنسی دنیا میں اس کے نمائندے البرٹ آئن سٹائن ہیں اور مذہب کی دنیا میں کیرن آرمسٹرانگ۔آئن سٹائن کا کہنا ہے کہ سائنس کا تعلق موجود کی دنیا سے ہے (کیا ہے what is) جبکہ مذہب کا تعلق مثالی دنیا سے ہے (کیا ہونا چاہیے what should be) وہ لکھتے ہیں 'ہمارے لئے یہ جاننا کہ کیا ہے، ہمیں نہیں بتاتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے' آئن سٹائن کا خیال تھا کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہیں بلکہ وہ دونوں انسانیت کے ارتقا میں ہماری رہنمائی کرسکتے ہیں ان کا مشہور جملہ ہے...مذہب کے بغیر سائنس لنگڑی ہے۔سائنس کے بغیر مذہب اندھا ہے

آئن سٹائن کا خیال تھا کہ اس مادی دنیا میں صرف وہی لوگ سائنس کی تحقیق اور ریاضت میں زندگی گزار سکتے ہیں جن میں روحانی لوگوں اور درویشوں کی سی بے غرضی اور قربانی کا جذبہ ہو۔(حوالہ 6) آئن سٹائن خدا اور مذہب کا ذکر تو کرتے تھے لیکن ان کا خدا اور مذہب کا تصور نہایت غیر روایتی تھا۔

آئن سٹائن کی طرح کیرن آرمسٹرانگ نے بھی سائنس اور مذہب کے درمیان ایک پل تعمیر کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا خدا اور مذہب کا تصور بھی غیر روایتی ہے۔ان کا خیال ہے کہ ایک ایسے خدا کا تصور جو سات آسمانوں پر ایک تخت پر بیٹھا ہے پرانا اور بوسیدہ ہو چکا ہے۔ کیرن آرمسٹرانگ کے خیال میں بیسویں صدی میں ہولوکوسٹ کے المیے نے روایتی مذہب کے خدا کے تصور کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔وہ سنتوں، سادھوؤں اور درویشوں کے خدا کے تصور کو ترجیح دیتی ہیں جو آسمانوں پر نہیں لوگوں کے دلوں میں رہتا ہے۔(حوالہ 7) کیرن آرمسٹرانگ مذاہب عالم کی اس روحانی روایت کے قریب دکھائی دیتی ہیں جو ہمیں انسان دوستی

اور احترامِ آدمیت کا درس دیتی ہے یہی روایت مشرق کی صوفیانہ شاعری میں دکھائی دیتی ہے۔

مسجد ڈھا دے، مندر ڈھا دے، ڈھا دے جو کجھ ڈھیندا اے

پر کسی کا دل نہ ڈھائیں، رب دلاں وچ رہندا اے

آئن سٹائن اور کیرن آرمسٹرانگ دو مختلف روایتوں کو قریب لانے کی کوشش کرتے رہے۔میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

کیتھولک چرچ کے پادریوں اور سائنسدانوں کے درمیان جو سرد جنگ تین سوسال سے چل رہی تھی اس میں سائنسدانوں کو اس دن کامیابی ہوئی جب عیسائیت کے مذہبی رہنماؤں نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ کیتھولک چرچ نے سائنسدانوں پر جو مظالم ڈھائے تھے وہ ناروا اور ناجائز تھے۔9 مئی 1983ء کیتھولک پوپ نے گلیلیو پر تین سوسال پہلے ظلم کرنے کی معافی مانگی۔

دیر آید درست آید

میرا خیال ہے کہ ہم اکیسویں صدی میں انسانی تاریخ کے اس موڑ پر کھڑے ہیں جہاں مذہب اور سائنس کے نمائندوں کو ایک دفعہ پھر مکالمہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔سٹیون ہاکنگ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ سائنس اب تک دو نظریوں کی پیروی کررہی ہے ایک نظریہ اجرامِ فلکی کی اور ایک ایٹم کے اسرار ورموز کی وضاحت کرتا ہے۔سائنسدانوں کی کوشش ہے کہ وہ ایک ایسا نظریہ دریافت کریں جو دونوں نظریوں کا احاطہ کرسکے۔(حوالہ 8) اسی طرح مذہبی دنیا میں ایسے دانشور پیدا ہورہے ہیں جن کا خواب ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں مذہب کی آزادی ہو freedom of religion تاکہ آزادیٔ فکر پنپ سکے۔مذہب کو لوگوں کا ذاتی فعل سمجھا جائے اور معاشرے کے قوانین سیکولر اور انسان دوستی کی بنیادوں پر بنائے جائیں تاکہ ہر شہری کو برابر کے حقوق اور مراعات حاصل ہوں۔

میرا خیال ہے کہ وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو سکولوں اور کالجوں میں سائنس اور فلسفے کی تعلیم دیں تاکہ وہ اندھے ایمان کی بجائے عقل وآگہی کو اپنا رہنما بنائیں اور علم ودانائی کی راہ اختیار کریں۔میری ذاتی زندگی میں اندھے ایمان سے علم وآگہی کا سفر میرے لئے ایک دلچسپ اور بصیرت افروز سفر تھا۔

REFERENCES

1. Russell Bertrand *Why I am not a Christian.*
 A Touchstone Book New York 1957
2. Freud Sigmund *The Future of an Illusion*
WW Norton and Co New York 1961
3. Soyinka Wole *Art, Dialogue and Outrage*
Pantheon Books New York 1993
4. Paz Octavio *Alternating Current*
Arcade Publishing New York 1967
5. Hoodbhoy Pervez *Islam and Science*
Zed Books Ltd London 1991
6. Einstein Albert *Ideas and Opinions*
Crown Trade Paperbacks New York 1982
7. Armstrong Karen *AHistory of God*
Ballantyne Books New York 1993
8. Hawking Stephen, A Brief History of Time
Bantam Books New York 1990
9. Salam Abdus *Science and Religion*
Lecture Delivered at International Symposium Cordoba 1987

سراب کا مستقبل

تحریر:سگمنڈ فرائڈ ترجمہ:ڈاکٹر خالد سہیل

(سگمنڈ فرائڈ کی کتاب **The Future of An Illusion** جو پہلی بار 1927ء میں چھپی تھی، کی تلخیص اور ترجمہ)

(1)

جب کسی شخص کی زندگی کا بیشتر حصہ اس غور و خوض میں گزر گیا ہو کہ وہ جس تہذیب اور ثقافت میں پلا بڑھا ہے، ان کا ماضی کیسا تھا؟ اُن کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں؟ اور ان کی نشو ونما میں کن عوامل نے اہم کردار ادا کیا تھا؟ تو کبھی کبھار وہ یہ بھی سوچتا ہے کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ اور ان میں کس قسم کی تبدیلیوں کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اس موضوع پر غور کرنے سے ہمیں اس بات کا جلد ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ موضوع اتنا بڑا ہے کہ اس پر صرف چند لوگ ہی سیر حاصل بحث کر سکتے ہیں کیونکہ اکثر لوگ اس موضوع کے صرف ایک مخصوص پہلو پر تحقیق اور غور خوض کرتے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے ماضی اور حال سے ہی پوری طرح باخبر نہیں، ان کے لئے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائی کرنا اور بھی مشکل ہے اور اگر وہ اس کی کوشش بھی کریں تو ان کی رائے میں ان کی ذاتی پسند و ناپسند توقعات، امیدوں اور خوابوں کی حقائق کی نسبت زیادہ پرچھائیں نظر آئے گی اور ایسی رائے میں معروضی پہلو کم ہوگا۔ میرے خیال میں اکثر لوگ اپنے حال کو اپنے ماضی اور مستقبل سے جوڑ کر نہیں دیکھتے اور ان رشتوں پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے۔

اس لئے جو شخص بھی مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرے گا، اسے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا ہوگا اور نئے اور انجان علاقوں میں قدم رکھنا پڑے گا۔ مستقبل کے بارے میں بھلا

کون حتمی رائے دے سکتا ہے۔ کل کی بھلا کس کو خبر ہے۔

اس صورتِ حال میں چاہئے تو یہی کہ یا تو میں ذاتی طور پر اس کام سے دستبردار ہو جاؤں اور کہوں کہ یہ بھاری بوجھ مجھ سے نہ اُٹھ پائے گا اور میں اپنی توجہ انسانی زندگی کے صرف ایک پہلو پر مرکوز کروں اور اس کے بارے میں اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار کروں۔

میرے اس مضمون کا موضوع انسانی تہذیب وثقافت ہے اور تہذیب وثقافت سے میری مراد انسانی زندگی کے وہ تمام پہلو ہیں جو انسانوں کو حیوانوں سے متمیز کرتے ہیں۔ ان میں وہ علوم بھی شامل ہیں، جن کی وجہ سے ہم نے فطرت پر بالادستی اور اس سے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دولت حاصل کی ہے اور وہ تمام قوانین، رسوم اور روایات بھی شامل ہیں جن کی روشنی میں ہم ایک دوسرے سے انسانی رشتے قائم کرتے ہیں اور دولت کی تقسیم کرتے ہیں۔

میری نگاہ میں تہذیب اور ثقافت کے یہ دونوں پہلو آپس میں مربوط ہیں۔ ایک طرف انسانوں کے آپس کے رشتے اور ان کی جمع کی ہوئی دولت اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ انسان اپنی خواہشات کی کس حد تسکین کر سکتے ہیں تو دوسری طرف زندگی کے اس کاروبار میں انسان دوسرے انسانوں کو اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے (چاہے وہ مزدوری ہو، دولت ہو یا جنسی آسودگی ہو) استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ میرے خیال میں انسان بنیادی طور پر تہذیب کا دشمن ہے کیونکہ تہذیب اجتماعی مفادات کی نگہبانی کرنا چاہتی ہے جب کہ انسان اپنی انفرادی خواہشات کی تسکین کو اہمیت دیتے ہیں۔ ایک پر امن معاشرتی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ہر فرد کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں، ان قربانیوں سے انسان مجموعی طور پر دولت اور فطرت سے ایسا رشتہ قائم کرتے ہیں جس میں سب کی بھلائی مضمر ہوتا کہ ایک خوشحال اور منصفانہ معاشرے کی تشکیل ہو سکے۔ اگر انسان اجتماعی طور پر ایسا معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوں تو انسانی جذبات بے قابو ہو جاتے اور وہ سائنس اور ٹکنالوجی کو انسانی ارتقا کی بجائے انسانی تباہی کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے وہ چیزیں اور وہ نظام جنہیں تعمیر کرنے میں طویل عرصہ لگتا ہے، انہیں تباہ و برباد کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تہذیب وثقافت کے ارتقا کے لئے ایک اقلیت اپنی آرا

وراپنی اقدار اکثریت پر مسلط کرتی رہی ہو۔ کیونکہ اسی اقلیت کا دعویٰ تھا کہ وہ انسانوں کی معاشرتی زندگی کے لئے ایسی بصیرتوں کی حامل تھی، جن سے اکثریت محروم تھی۔ تہذیب کے ارتقا کا یہ سفر تضادات سے پر رہا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کا بھی احساس ہے کہ انسانوں کے لئے فطرت پر قابو پانے کا عمل انسانی رشتوں میں ایک توازن قائم کرنے سے آسان رہا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانوں کی اکثریت اس قابل ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے دوران دوسروں کا استحصال نہ کرے یا ہمیں ان کے منفی جذبوں، رویوں، جذبات اور اعمال سے دوسروں کو بچانے کے لئے ہمیشہ قوانین اور روایات کا سہارا لینا پڑے گا۔ جب ہم انسانی مسائل اور رشتوں پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ فطرت پر قابو پا کر دولت حاصل کرنا اور ایسی دولت کو انسانوں میں مساوی تقسیم کرنا، تاکہ سب ایک خوشحال اور صحتمند زندگی گزار سکیں، ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اس عمل کا ایک پہلو مادی ہے تو دوسرا نفسیاتی ہے۔

انسانوں کے معاشی مسائل نفسیاتی مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر انسانوں کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو عین ممکن ہے کہ تہذیب اور ثقافت کی روایت بری طرح مجروح ہو جائے، کیونکہ عوام کی اکثریت کاہل اور سادہ لوح ہوتی ہے۔ وہ اپنے جذبات کی فوری تسکین چاہتی ہے اور وہ بڑے مقاصد کے لئے چھوٹے مقاصد قربان نہیں کرنا چاہتی اس لئے ان پر اقلیت کو قوانین اور پابندیاں نافذ کرنی پڑتی ہیں۔ عوام پر پابندیاں نافذ کرنا اتنا تکلیف دہ نہ ہو۔ اگر ان کے رہنما ایسے انسان ہوں جو باعمل اور اعلیٰ اقدار و کردار کے مالک ہوں، عوام ان کی عزت کرتے ہوں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیں۔ ایسی صورت میں عوام کے ایک صحتمندانہ اور منصفانہ زندگی کو اختیار کرنے کے زیادہ امکانات ہو سکتے ہیں۔ ایسے رہنماؤں اور لیڈروں سے ہمیں یہ امید ہوگی کہ انہیں عوام سے ہمدردی ہوگی اور وہ زندگی کی بصیرتیں رکھتے ہوں گے۔

ایسے رہنماؤں کی موجودگی میں عوام کے لئے قوانین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی رہنماؤں کو تھوڑا بہت دباؤ تو ڈالنا ہی پڑتا ہے کیونکہ عوام بنیادی طور پر نہ تو سخت کام کرنا اور نہ ہی اپنی خواہشات کی تسکین کو ملتوی کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے جذبات پر فوری عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بعض لوگ میرے ان خیالات پر اعتراض کریں گے اور کہیں گے کہ عوام پر دباؤ اسی لئے ڈالنا پڑتا ہے کیونکہ ہماری تہذیب اور ہمارے نظام میں بہت سی خامیاں ہیں۔ ایک مثالی معاشرے میں اس کی ضرورت نہ ہوگی، ہر شخص ایک صحتمند زندگی گزارے گا اور دوسروں کا استحصال نہ کرے گا۔ چونکہ ایسا معاشرہ قائم نہ ہوسکا، اس لئے غیر منصفانہ نظام نے لوگوں کو غصیلا اور باغی بنادیا ہے۔ اگر ہم اگلی نسلوں کے بچوں کی محبت، شفقت اور ایک ذمہ دارانہ ماحول میں پرورش کریں گے تو وہ ایک بہتر نظام کو تشکیل دیں گے۔ وہ نہ صرف اپنا کام ذمہ داری سے کریں گے بلکہ ایک دوسرے کی خواہشات اور حقوق کا احترام بھی کریں گے۔ اور اگر معاشرتی فلاح و بہبود کے لئے قربانی کی ضرورت ہوگی تو وہ خوشی سے قربانی بھی دیں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانی ارتقا کے جس مرحلے پر ہم سے انسانی زندگی گزار رہے ہیں، اس معاشرے میں کیا قربانیاں دینے والے عوام کی اور ایسے رہنماؤں کی امید رکھنا جو خدمتِ خلق کو اپنا فریضہ سمجھیں اور قوموں کی صحتمند خطوط پر پرورش اور رہنمائی کریں اور ایسے معاشرے کو تشکیل دیں جہاں دباؤ اور جبر کی کم از کم ضرورت پیش آئے۔ میرا خیال ہے کہ ہر دور میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہوگا جو خود غرضانہ اور مجرمانہ ذہنیت اور کردار کا مالک ہوگا اور عوام کے امن اور سکون میں روڑے اٹکائے گا۔ لیکن اکثریت کی تعلیم و تربیت ایسے خطوط پر ہوسکتی ہے کہ وہ ایک صحتمند اور منصفانہ نظام کے لئے قربانیاں دے سکیں۔ اگر ایسا ممکن ہو جائے تو وہ انسانی معاشرے کے لئے ایک اچھا شگون ہوگا۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اس گفتگو کے دوران میں اپنے اصل موضوع سے کافی دور نکل آیا ہوں لیکن میں یہ بات واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میرے اس مضمون کا مقصد انسانی تہذیب و ثقافت کے مستقبل کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا نہیں ہے۔ میرے پاس نہ تو ایسا علم ہے اور نہ ہی میں کسی ایسے طریقہ کار سے واقف ہوں جس سے ایسے معاشرے کے قیام کے تجربے کے خواب کو شرمندہ تعبیر کیا جاسکے۔ میں تو صرف اس موضوع پر اپنے ذاتی خیالات اور نظریات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

(2)

ہماری گفتگو آہستہ آہستہ معاشی دائروں سے نکل کر نفسیاتی دائروں میں داخل ہوتی جارہی

ہے۔ پہلے ہم تہذیب اور ثقافت کو معاشرے میں دولت کی فراہمی اور تقسیم کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کررہے تھے، لیکن جب ہمیں اندازہ ہوا کہ کسی بھی تہذیب کو قائم رکھنے کے لئے ہمیں عوام پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ منصفانہ اور صحتمند معاشرے کے قیام کے لئے وہ اپنی خواہشات کی تسکین کی قربانیاں دے سکیں اور عین ممکن ہے کہ وہ ان پابندیوں کے خلاف احتجاج اور بغاوت کی آواز بلند کریں گے اور تہذیب کی عمارت پر حملہ آور ہوں گے تو ہمیں احساس ہوا کہ معاشرتی مسائل کے اس شعور سے ہم معاشی دائرے سے نکل کر انسانی تہذیب کے نفسیاتی دائرے میں داخل ہوگئے ہیں۔

جب ہم انسانی نفسیات کے حوالے سے بات آگے بڑھاتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے انفرادی اور معاشرتی تعلقات کافی پیچیدہ ہیں۔ انسانی بچے اپنی جبلتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات کی فوری تسکین چاہتے ہیں انسانی معاشرہ ان پر کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے۔ تاکہ انسانی زندگی اور معاشرے میں ایک ہمدردی اور توازن قائم ہوسکے۔ بعض انسانوں کے لئے ان پابندیوں کو قبول کرنا آسان ہوتا ہے اور بعض کے لئے بہت مشکل۔ اور بعض انسان تو ان پابندیوں اور قربانیوں کی وجہ سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہوجاتے ہیں۔ وہ ان جبلتوں پر جو انہوں نے حیوانی آباواجداد سے وراثت میں پائی ہیں، قابو نہیں پاسکتے اور تہذیب کو درہم برہم کرتے رہتے ہیں۔ وہ انسان اپنی زندگی حیوانی سطح پر گزارنا چاہتے ہیں۔ آج بھی ہم ان کی مثالیں ایسے معاشروں میں پاتے ہیں، جہاں دوسرے انسانوں کے گوشت کو کھانا، قریبی رشتہ داروں سے جنسی اختلاط کرنا، (Incest) اور انسانوں کا قتل کرنا ابھی ختم نہیں ہوا۔ ان لوگوں نے انسانی اقدار کو ابھی پوری طرح نہیں اپنایا اور اپنی جبلی خواہشوں پر قابو پانا نہیں سیکھا۔ ایسی اقدار اور ایسی پابندیاں ایک انسانی معاشرے کے قیام کے لئے ناگزیر ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ انسانی معاشرت اور تہذیب کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ایسے حیوانی اعمال سے معاشرہ پاک ہوتا جائے گا اور ایسے لوگوں کی تعداد میں بتدریج کمی آتی جائے گی۔

جب ہم انسانی دماغ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ انسانوں نے سائنس اور ٹکنالوجی میں تو بہت ترقی کی ہے لیکن آج کے انسانی بچے کا دماغ آج سے ہزاروں سال پیشتر کے انسانی بچے کے دماغ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آج کا بچہ

جس معاشرے میں پرورش پاتا ہے، اس سے اُس کے شعوری اور لاشعوری ضمیر (Super Ego) کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی، صحیح اور غلط کی تمیز سیکھتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ ایک جسمانی اور نفسیاتی ہستی سے معاشرتی اور اخلاقی ہستی بن جاتا ہے۔ انسانی ضمیر کی پرورش انسانی شخصیت کے ارتقا کا ایک اہم مرحلہ ہے۔ جن لوگوں میں ضمیر کی پرورش صحتمند خطوط پر ہوتی ہے وہ جوان ہو کر تہذیب کی مخالفت کرنے کی بجائے اس کا تعاون کرتے ہیں اور انسانی معاشرے کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور جس معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوتی ہے، اتنا ہی وہ معاشرہ صحتمند خطوط پر استوار ہوتا ہے اور لوگوں کی خارجی پابندیاں آہستہ آہستہ داخلی پابندیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور انسانوں کے ذہنوں میں حکومت کی خارجی عدالت کی بجائے ضمیر کی داخلی عدالت قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوام کے لئے ایک صحتمند زندگی گزارنے کی خاطر خارجی اور داخلی دونوں طرح کی عدالت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کے لئے نفسیاتی دباؤ کے ساتھ ساتھ معاشرے کا اخلاقی دباؤ بھی ضروری ہوتا ہے۔ صدیوں کے معاشرتی ارتقاء کے بعد ہمیں بہت سے ایسے لوگ مل جائیں گے جو قتل سے تو دور رہیں گے لیکن اگر انہیں سزا کا ڈر نہ ہو تو وہ جھوٹ بولنے، دھوکا دینے، اپنے غصے اور جنسی جذبات کے غیر صحتمندانہ اظہار سے دریغ نہ کریں گے۔ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر رکھنے کے لئے خارجی قوانین اور پابندیاں ضروری ہیں۔

اگر کسی معاشرے میں ایسے گروہ، طبقے اور اقلیتیں موجود ہوں جو بنیادی حقوق سے محروم ہوں تو وہ گروہ ہر ممکن کوشش کریں گے کہ ایسی صورتِ حال کو بدلیں تا کہ ایک منصفانہ نظام قائم ہو سکے اور امیر وغریب، مرد اور عورتیں، اور کالے اور گورے سب ایک ہی قطار میں کھڑے ہو سکیں۔ ایک غیر منصفانہ نظام میں اقلیتوں میں غصے، نفرت اور بغاوت کے جذبات بڑھتے ہیں اور وہ تہذیب اور قانونی پابندیوں کو تباہ کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ اگر کسی معاشرے میں ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے کہ غیر منصفانہ نظام سے اکثریت متاثر ہونے لگے اور صرف ایک اقلیت آسودگی اور خوشحالی کی زندگی گزار رہی ہو تو وہ اکثریت احتجاج کرنے لگتی ہے اور بالآخر ایک انقلاب لے آتی ہے۔ میری نگاہ میں اسی اقلیت کو جو اکثریت پر ظلم اور جبر کرتی ہو اور ان کے مسائل سے ہمدردی نہ رکھتی ہو اسے حکومت کرنے کا ویسے بھی حق نہیں ہونا چاہیے۔

کسی معاشرے کی تہذیب کے ارتقاء کے لئے صرف وہ پابندیاں ہی اہم نہیں ہیں جنہیں لوگوں نے اپنے ضمیر کی آواز کے طور پر اپنا لیا ہو بلکہ اس کے لئے وہ تخلیقی کاروائیاں اور فن پارے بھی اہم ہیں جو اسی معاشرے کا سرمایہ ہیں اور جن سے لوگ ایک مخصوص قسم کا حظ اٹھاتے ہیں۔ کسی معاشرے کے تہذیبی سرمائے میں وہ آدرش بھی شامل ہوتے ہیں، جن کے حصول کے لئے عوام ہر وقت کوشاں رہتے ہیں اور جو لوگ ان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں، انہیں انعام واکرام سے نوازتے ہیں۔ ایسے آدرشوں تک رسائی کے لئے افراد کی کوشش اور صلاحیتیں اور معاشرے کی مدد اور حوصلہ افزائی سب اہم کردار ادا کرتے ہیں، بعض دفعہ تو کوئی معاشرہ اپنے آدرشوں کو اتنا عزیز رکھتا ہے کہ وہ ایک مقام پر پہنچ کر یہ ثابت کرنے لگتا ہے کہ اس کے آدرش باقی معاشروں کے آدرشوں سے بہتر ہیں اس طرح ان میں ایک طرح کا احساسِ برتری پیدا ہو جاتا ہے اور یہ احساس مختلف معاشروں، قوموں اور ثقافتوں میں رشک، حسد اور دشمنی کے بیج بوتا رہتا ہے۔ عوام کی اس احساسِ برتری کا بعض دفعہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عوام جن رہنماؤں سے شاکی ہوتے ہیں وہ رہنما جب دوسری قوموں سے مقابلے پر اتر آتے ہیں، تو یہی عوام ان رہنماؤں کا ساتھ دینے لگتے ہیں اور انہیں اپنا ہیرو بنا لیتے ہیں اس طرح وہ لیڈر جو عوام میں مقبول نہیں ہوتے، جب دشمن سے جنگ کا اعلان کرتے ہیں تو وہ اپنی عوام کی ہمدردیاں حاصل کر لیتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کئی ظالم اور جابر حاکموں نے اس حربے سے خوب فائدہ اُٹھایا اور مدتوں حکومت کرتے رہے۔

ہر معاشرے کے لوگ اپنے فنی اور تخلیقی کمالات کا خوشی سے ذکر کرتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات کہ عوام کی اکثریت ان فنونِ لطیفہ کے شاہکاروں سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کے ذوق کی ان خطوط پر تربیت نہیں کی جاتی لیکن وہ پھر بھی ان شاہکاروں پر فخر کرتے ہیں۔

جب ہم کسی معاشرے کی نفسیاتی زندگی پر توجہ مرکوز کرتے ہیں اور عوام کے آدرشوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اپنے رہنماؤں اور فنونِ لطیفہ کے شاہکاروں پر فخر کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اور حقیقت بہت اہم کردار ادا کرتی ہے، جس پر اب تک ہم نے توجہ مرکوز نہیں کی اور وہ ہیں ان کے مذہبی نظریات۔ میری نگاہ میں مذہبی نظریات کی اہمیت سراب

سے زیادہ کچھ نہیں اور میں اسی موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

(3)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی معاشرے میں مذہبی نظریات کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے؟

ہم اپنی گفتگو کے دوران دیکھ چکے ہیں کہ ہر معاشرے میں تہذیبی اور قانونی پابندیوں کے خلاف لوگوں میں غصے، نفرت اور بغاوت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیں کہ معاشرے سے پابندیاں اٹھا دی گئی ہیں اور

ہر مرد کو کھلی اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ
جس عورت سے چاہے مباشرت کرے اور جس رقیب کو چاہے قتل کرے اور
ہر شخص کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے کہ وہ
جس شخص کی جو چیز پسند کرے، لے لے

تو بظاہر تو یہ صورتِ حال بہت دلکش نظر آتی ہے لیکن اگر ہر شخص کو ہر دوسرے شخص کی چیزیں بے دریغ حاصل کرنے کی اجازت ہو تو حقیقت میں سوائے ایک شخص کے باقی سب لوگ پریشان ہوں گے اور وہ ایک شخص؛ ایک ڈکٹیٹر، ایک ظالم اور ایک جابر انسان ہوگا۔ جس کی نہ تو کوئی عزت کرے گا اور نہ ہی معاشرے کو اس سے فائدہ ہوگا۔

ایسی صورتِ حال سے بچنے کے لئے مذہب نے ہمیں قانون دیا کہ:

"کسی انسان کو دوسرے انسان کو قتل کرنے کی اجازت نہیں۔" اس گفتگو سے یہ واضح ہے کہ اگر کوئی شخص تہذیب و ثقافت سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ کوئی دانشمندانہ انداز میں نہیں سوچتا۔ اگر تہذیب ختم ہو جائے گی تو ہم فطرت کے ساتھ حیوانی سطح پر زندگی گزاریں گے اور ایسی زندگی مسائل اور مصائب سے پُر ہوگی۔ ایسی صورت میں اگرچہ ہماری خواہشات پر کوئی پابندی تو نہ ہوگی لیکن ہمیں اپنی خواہشات کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ فطرت ایک حوالے سے بڑی ظالم ہے اور انسانوں پر بڑے ظلم کرتی ہے۔ انسانی تہذیب کے ارتقاء کا ایک مقصد فطرت کے مظالم سے بچنا ہی تو ہے۔ ہم جس قدر مہذب ہو رہے ہیں، اسی قدر ہم فطرت پر قابو پا رہے ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم کبھی بھی پوری طرح فطرت پر قابو نہ پا سکیں گے۔ زلزلے، سیلاب، آندھیاں اور طوفان آتے رہیں گے اور انسانی جانوں کو ضائع کرتے

رہیں گے۔ انسان بیماریوں کے زیرِ عتاب بھی آتے رہیں گے اور اگر ان سب سے بچ بھی گئے تو انہیں موت سے نبرد آزما ہونا پڑے گا جس کا نہ تو ہمیں کوئی علاج مل سکا ہے اور نہ ہی مل پائے گا۔ فطرت کے یہ طاقتور ہتھیار ہمیں بے بس محسوس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی بے بسی سے نجات حاصل کرنے اور اپنے تئیں طاقتور محسوس کرنے کے لئے انسانوں نے تہذیب کو فروغ دیا ہے۔ جب انسانوں کا فطرت کے جبر سے مقابلہ ہوتا ہے تو وہ اپنے مسائل اور تضادات کو ایک طرف رکھ کر فطرت کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں زندگی عزیز ہے۔

جہاں انسان اجتماعی طور پر فطرت سے مقابلہ کرتے ہیں وہیں انسان اپنی انفرادی زندگی میں بھی فطرت سے نبرد آزما رہتے ہیں اور اسے قسمت (Fate) کا نام دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ انسان جو خارجی پابندیوں کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور ان کے خلاف غصے اور نفرت کے جذبات رکھتا ہے وہ قسمت کا کیسے مقابلہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی تہذیب انسان کی مدد کرتی ہے تاکہ وہ اپنے محدود وسائل سے ایسا ماحول اور طرزِ زندگی اختیار کر سکے جس سے فطرت اور قسمت اس پر کم از کم اثر انداز ہوں۔

اس عمل کی ابتدا بچپن سے ہوتی ہے۔ بچہ اپنے آپ کو بالکل بے بس اور مجبور محسوس کرتا ہے اور اپنے والدین سے خوف کھاتا ہے۔ لیکن وہ باپ جس سے وہ ڈرتا ہے وہ باپ اسے باقی دُنیا کے مصائب اور مسائل سے بچاتا ہے اور نوجوانی تک پہنچتے پہنچتے انسان اپنے خوابوں میں فطرت اور دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے باپوں اور خداؤں کے ہیولے بناتا ہے اور ان سے مدد مانگتا ہے تاکہ وہ اسے دشمنوں سے بچاتے رہیں۔

اس طرح خداؤں کا تصور انسانی زندگی میں کئی حوالوں سے اہم ہے۔

خدا انسان کو فطرت کے مظالم سے بچاتے ہیں
خدا انسان کو قسمت کے جبر سے محفوظ رکھتے ہیں اور
خدا انسان کو ان قربانیوں کا انعام دیتے ہیں جو وہ تہذیب کے ارتقا کے سلسلے میں دیتا ہے۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ وہی خدا جنہوں نے فطرت کو جنم دیا ہے، اس کی قوانین میں عام حالات میں دخل اندازی نہیں کرتے اور اگر مذہبی کتابوں میں اس دخل اندازی کا ذکر آتا بھی ہے تو ہم انہیں معجزے (Miracles) کہتے ہیں۔

انسانی ارتقاء کے سفر میں انسان اپنی فطرت کی تکمیل کرنا چاہتا ہے اور جسم کی ضروریات سے زیادہ اپنی روح کی تسکین اور نشوونما چاہتا ہے۔ آہستہ آہستہ انسان ایسی روحانی خصوصیات کا حامل بن جاتا ہے کہ جو اسے زندگی اور موت کے مسائل سے نبردآزما ہونے میں مدد دیتی ہیں۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی طرح کائنات میں جمادات اور نباتات کی زندگیاں قوانینِ فطرت کے تابع ہیں اور جب قوانین شکنی ہوتی ہے۔ چاہے وہ حیوانوں سے ہو یا انسانوں سے تو ان کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ انسانوں نے یہ باور کرلیا کہ اگر انسانی نتائج مرتب ہونے سے پہلے مرجائیں تو وہ اعمال ان کی حیات بعد الموت کو متاثر کرتے ہیں۔

اگر انسان دوسرے انسانوں پر ظلم کرتے ہیں تو انہیں ان کی سزا مرنے کے بعد ملتی ہے۔

انسانوں نے ایسے مذہبی نظریات وضع کئے جس کے تحت انسانی زندگی کا ایک مقصد قرار پایا اور انہیں بتایا گیا کہ روزِ حشر تمام نیکیوں کا انعام اور سب بدیوں کی سزا ملے گی کیونکہ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔ اس طرح سب ظالموں کو سزا ملے گی اور سب مظلوم اپنی دُنیاوی زندگی کی تکالیف کا اجر اخروی زندگی میں پائیں گے۔ انسانوں نے نیکی بدی کے اس حساب کے لئے آسمانی اور روحانی طاقتوں کو تخلیق کیا جن کا کام دُنیا میں عدل وانصاف قائم کرنا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ تمام روحانی اور آسمانی طاقتیں ایک طاقت میں جمع ہوگئیں، جسے ہم نے خدا کا نام دے دیا۔ اس طرح انسان اور خدا کے رشتے میں بچے اور باپ کے رشتے کی قربت اور گہرائی پیدا ہوگئی اور خدا کے ماننے والے انسانوں نے خدا کے ساتھ ایک خاص رشتہ قائم کرلیا اور اپنے آپ کو اس کے چہیتے لوگوں (Chosen People) میں شامل کرلیا۔

میں نے جن مذہبی تصورات کا اختصار سے ذکر کیا ہے۔ ان کے ارتقاء میں کئی قوموں اور کئی تہذیبوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ میں نے یہاں صرف عیسائی نظریات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

عیسائی معاشروں میں مذہبی نظریات کو بہت اہم اور مقدس سمجھا جاتا ہے۔ لوگ ان کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوتے ہیں۔

ہمارے لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان نظریات کی نفسیاتی اہمیت کیا ہے اور انسانوں کے لئے یہ نظریات اتنے مقدس کیوں کر بن گئے ہیں؟

(4)

ہماری گفتگو کے اس مرحلے پر عین ممکن ہے کہ میرے خیالات کا مخالف مجھ سے کہے ”آپ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ معاشرے کی تہذیب نے ان مذہبی نظریات کو جنم دیا ہے اور اس مہذب معاشرے کے لوگ ان سے چھٹکارا بھی حاصل کر سکتے ہیں تو مجھے یہ بات عجیب سی لگتی ہے۔ مجھے مذہبی نظریات معاشرے کے ان قوانین کی طرح نہیں لگتے جن کے تحت لوگ دولت اور محنت کی تقسیم اور بچوں اور عورتوں کے حقوق کے فیصلے کرتے ہیں۔“

میرے مخالف کی بات بجا لیکن میں پھر بھی اس بات پر اصرار کروں گا کہ میری نگاہ میں مذہبی نظریات نے بھی انسانی تہذیب کی باقی روایات کی طرح انسان کی فطرت کی بالادستی سے نجات پانے کے لئے پرورش پائی ہے۔ انسان جب کسی معاشرے میں پرورش پاتا ہے تو وہ ریاضی کے مروجہ قوانین کی طرح مذہبی نظریات بھی وراثت میں پاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ان نظریات کو روحانی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ ان نظریات کو انسانوں نے وحی کے توسط سے حاصل کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان نظریات کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ ان نظریات کو وحی کے طور پر پیش کرنے سے ان کی تاریخی اہمیت کو کم کرنے اور مذہبی اہمیت کو بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مجھ سے اختلاف کرنے والے کہہ سکتے ہیں۔ ”آپ کی یہ دلیل کہ انسانی تہذیب کا ارتقاء فطرت پر بالادستی حاصل کرنے کی کوشش کا ماحصل ہے کچھ زیادہ وزنی نہیں لگتی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ انسانی تجسس کا نتیجہ ہو۔“ آپ نے خدا کے تصور کو پہلے باپ کے تصور سے تشبیہ دی اور پھر انسان کو بچوں کی طرح معذور اور مجبور ثابت کیا، آخر ان دلائل کا ماخذ کیا ہے۔“

ان اعتراضات کے جوابات میں، میں یہ کہوں گا کہ انسان کا متجسس ہونا بجا، لیکن تجسس اس پورے ارتقاء کی ادھوری تشریح ہے۔ انسانی فطرت کو سمجھنا چاہتا ہے تاکہ بعد میں اس پر قابو پا سکے اور بالادستی حاصل کر سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانوں میں بچپن کی بے بسی کا احساس بلوغت کے بعد بھی رہتا ہے۔ یہ علیحدہ بات کہ اس کی صورت بدل جاتی ہے۔ بچپن میں پہلے بچہ اپنی ماں کے قریب ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے اور اس کی خواہشات کی تسکین کرتی ہے۔ بعد

میں بچہ باپ کے قریب ہو جاتا ہے کیونکہ باپ اسے تحفظ کا احساس دلاتا ہے، لیکن باپ کے ساتھ یہ رشتہ دو دھاری تلوار کی طرح ہوتا ہے۔ ایک طرف بچہ باپ کی طاقت سے ڈرتا ہے اور دوسری طرف وہ باقی دُنیا سے باپ کی طاقت کے پیچھے چھپنا بھی چاہتا ہے۔ بعد میں یہی احساس اور یہی جذبہ انسان کو مذہب کے قریب لے آتا ہے اور جوانی میں ہمیں بچے اور باپ کے رشتے کا عکس انسان اور خدا کے رشتے میں نظر آتا ہے۔

(5)

آئیں ہم اپنی گفتگو کو ایک قدم آگے بڑھائیں اور مذہبی نظریات کی نفسیاتی اہمیت جاننے کی کوشش کریں۔

میری نگاہ میں مذہبی خیالات وہ حقائق اور نظریات ہیں جن تک انسان منطق کے ذریعے نہیں بلکہ ایمان کے راستے پہنچتا ہے۔ اس لئے اسے بہت عزیز رکھتا ہے۔ مذہبی انسان ان لوگوں کو جو ایمان نہیں رکھتے کم فہم سمجھتا ہے اور اپنے نظریات کی وجہ سے اپنے آپ کو خوش قسمت اور ایمان کی دولت سے مالا مال سمجھتا ہے۔

مذہبی علوم اور دیگر علوم میں یہ فرق ہے کہ اگر ہم بچپن میں جغرافیے کا سبق پڑھتے ہیں تو بعد میں ہم ان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہم جوانی میں دُنیا بھر میں گھوم کر ان جگہوں کو خود جا کر دیکھ سکتے ہیں، جنہیں ہمیں جغرافیے کے اساتذہ نے پڑھایا تھا یا ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا، لیکن مذہبی علوم پر یہ اصول لاگو نہیں ہوتا۔ جب ہم مذہبی نظریات کی حقیقت کے بارے میں اساتذہ سے سوال پوچھتے ہیں تو ہمیں کچھ اس قسم کے جواب ملتے ہیں۔

ہمیں ان نظریات پر اس لئے ایمان لانا چاہئے، کیونکہ ہمارے آباؤاجداد ان پر ایمان لائے تھے۔

ہمیں ان نظریات کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے اور ان کے بارے میں سوال نہیں پوچھنے چاہئیں۔

ایک وہ زمانہ تھا جب ان نظریات کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو سزا ملا کرتی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ نظریات سچے ہیں تو پھر ان پر سوالات اور اعتراضات کی ممانعت کیوں؟ سوال تو وہ نظریہ برداشت نہیں کر سکتا جو عدم اعتماد کا شکار ہو۔ اگر مذہبی نظریات

حقائق اور سچائیوں پر مبنی ہوتے تو وہ ہر قسم کے سوالات کو خوش آمدید کہتے۔

مذہبی عقائد کے بارے میں یہ دلیل پیش کرنا کہ ہمارے آباؤاجداد ان پر ایمان لائے تھے، کوئی مؤثر دلیل نہیں۔ ہمارے آباؤاجداد اور بزرگ کئی حوالوں سے کم علم اور کم فہم تھے۔ وہ بہت سی ایسی چیزوں پر یقین رکھتے تھے جو بعد میں غلط ثابت ہوئیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہبی عقائد بھی تو اس گروہ کا حصہ نہیں ہیں؟ ہمارے بزرگوں نے اپنے عقائد کے حق میں جو دلائل پیش کیے ہیں۔ وہ نہ صرف کچھ زیادہ جاندار نہیں ہیں بلکہ غلط بیانیوں اور تضادات سے بھرے پڑے ہیں۔ ان عقائد کے بارے میں روحانیت اور وحی کے دلائل پیش کرنا انہیں معتبر اور قابل قبول نہیں بناتا۔

اس گفتگو سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ بچپن میں ہمیں جو علم دیا جاتا ہے اس کا سب سے اہم حصہ جس کا تعلق زندگی کے رازوں سے ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ غیر معتبر ہوتا ہے کیونکہ ہم اس کی کوئی تصدیق نہیں کر سکتے۔ یہ صورتِ حال ہمارے لئے ایک نفسیاتی الجھن پیدا کرتی ہے۔ میرا یہ کہنا کہ ہم مذہبی عقائد کے حق میں کوئی عقلی ثبوت یا کوئی منطقی دلیل پیش نہیں کر سکتے، کوئی نئی بات نہیں۔ ہم سے پہلے لاکھوں لوگوں کے دلوں میں مذہبی عقائد کے سلسلے میں سوال اور شک پیدا ہوئے۔ لیکن ان پر معاشرتی پابندیاں اتنی زیادہ تھیں کہ انہیں ان جذبات اور خیالات کے اظہار کی اجازت نہ دی گئی۔ انہیں ڈر تھا کہ ایسا کرنے سے ان کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی اور انہیں بہت سی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مذہبی عقائد کے بارے میں جتنے بھی ثبوت فراہم کیے جاتے ہیں ان کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے۔ اگر ان عقائد میں سے چند ایک کا بھی حال میں ثبوت فراہم کیا جا سکتا تو عین ممکن تھا کہ وہ لوگوں کی نظروں میں کچھ معتبر قرار پاتے۔ مثال کے طور پر مذہبی لوگ انسانی روح پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمیں بھی اس کا قائل کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ کسی طور پر بھی اسے ثابت نہیں کر سکتے اور لوگ اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ عقیدہ حقیقت پر مبنی بلکہ مذہبی لوگوں کے ذہن کی اختراع ہے۔ وہ عظیم لوگوں کی روحوں سے گفتگو کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں لیکن جو گفتگو بیان کرتے ہیں وہ نہایت ناقص ہوتی ہے۔

جب مذہبی لوگوں کا اس قسم کے سوالوں اور اعتراضات سے سامنا ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں

کہ مذہبی عقائد منطق کے دائرے سے باہر اور بالاتر ہیں، ایسے عقائد کی سچائیوں کو انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے۔ انہیں عقل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ مذہبی عقائد کو قبول کرنے کے لئے ایک داخلی تجربے کی ضرورت ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا کیا ہوگا جنہیں عمر بھر یہ تجربہ نصیب نہ ہو۔ ان لوگوں کو، جو عقل کی بجائے کسی داخلی تجربے کی وجہ سے نظریات قبول کریں، کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ نہ صرف اصرار کریں کہ دوسرے لوگ ان کے نظریات کو قبول کریں بلکہ ان پر عمل بھی کریں۔

بعض دفعہ مذہبی لوگ یہ بھی کہتے ہیں "فرض کریں اگر ایسا ہو گیا تو...؟"

میرے نزدیک ایسے نظریات کا تعلق حقیقت سے کم اور فکشن سے زیادہ ہے جنہیں عاقل و بالغ انسان اپنی زندگیوں کے لئے مشعلِ راہ نہیں بنا سکتے۔

جب میں اپنے بچوں کو پریوں کی کہانیاں سنایا کرتا تھا تو وہ پوچھا کرتے تھے "ابو! کیا یہ کہانی سچی ہے یا ہم اسے فرض کر لیں اور جب میں یہ کہا کرتا تھا کہ وہ کہانی سچی نہیں ہے تو ان کے چہروں پر ناگواری کے جذبات نمایاں ہوتے تھے۔ انہیں یوں لگتا تھا جیسے ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہو۔ میرے خیال میں مذہبی لوگ کتنی ہی اپنے عقائد کی پریوں کی کہانیاں سنا لیں، سمجھدار لوگ ان کے دام میں نہیں آئیں گے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے نامعتبر ہونے کے باوجود مدتوں لوگوں کو ان پر اعتراض کرنے کی اجازت نہیں دی گئی لیکن اب حالات بدل گئے ہیں اور اب ہم ان عقائد کو انسانی فکر اور تجربے کے ترازو میں تول سکتے ہیں اور ماننے والوں کے داخلی تجربے کی کسوٹی پر پرکھ سکتے ہیں۔

(6)

اب ہم ان سوالوں کے جواب کے قریب آ رہے ہیں جو ہم نے اس گفتگو کے شروع میں اٹھائے تھے۔ ہم مذہبی عقائد کی نفسیاتی وجوہات کی تلاش میں نکلے تھے۔ ہماری گفتگو سے یہ بات واضح ہوئی کہ مذہبی عقائد کی عمارت نہ تو انسانوں کے روزمرہ کے تجربات اور نہ ہی انسانی غور و تدبر کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ ان کی حقیقت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسا سراب جو انسانوں کے دلوں میں صدیوں کی پوشیدہ خواہشات کا ماحصل ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بچپن

کے احساسِ بے بسی کی وجہ سے انسان تحفظ کی تلاش میں رہتے ہیں۔ محبت کا تحفظ۔ جب بچپن میں باپ سے حاصل ہوتا ہے اور جوان ہو کر خدا سے۔ خدا کا تصور جو باپ کے تصور سے زیادہ طاقتور اور پائیدار سمجھا جاتا ہے، انسانوں کو زندگی کے مختلف خطرات کے خوف سے نجات دلاتا ہے۔ زندگی کو نیکی اور بدی کا ایک پیمانہ بھی دیتا ہے اور زندگی کی ناانصافیوں کا مرنے کے بعد ازالہ بھی فراہم کرتا ہے۔ خدا کا یہ تصور مذہب کے عقائد کے ایک نظام کا حصہ بن جاتا ہے اور اس نظام میں کائنات کی ابتدا، جسم اور روح کے رشتے اور زندگی کے بیسیوں مسائل اور تضادات کا حل بھی پیش کیا جاتا ہے۔

مذہب کا نظام انسانی ذہن کو بہت سے تضادات سے نجات دلاتا ہے۔ اس سے انسانوں کو بہت سے سوالوں کے بنے بنائے جواب مل جاتے ہیں اور انہیں اپنے مسائل پر خود غور کر کے حل تلاش نہیں کرنے پڑتے۔ اس طرح بہت سے انسان اس نظام میں ایک گونہ عافیت اور سکون محسوس کرتے ہیں۔

جب میں ان عقائد کو سراب کہہ کر پکارتا ہوں تو میرے خیال میں مجھے اپنے سراب کے تصور کی توضیح کرنی چاہئے۔ سراب سے میری مراد غلط نتیجہ نہیں جس کی ایک مثال یہ ہو سکتی ہے کہ اگلے زمانے کے طبیب یہ سمجھتے تھے کہ Tabes Dosalis کی بیماری جنسی بے راہ روی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بعض کم فہم لوگ تو آج بھی اس یقین رکھتے ہیں، لیکن اب ہم جانتے ہیں کہ وہ تصور غلط تھا۔ میری نگاہ میں سراب کی مثال کولمبس کا امریکہ پہنچ کر یہ کہنا تھا کہ اس نے ہندوستان تلاش کر لیا ہے۔ اسے ہندوستان پہنچنے کی اتنی خواہش تھی کہ اس خواہش کی شدت نے اسے غلط نتائج پر پہنچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس قسم کے سراب کی دوسری مثال بعض ماہرین نفسیات کا یہ تصور ہے کہ بچوں میں جنسی جذبات موجود نہیں ہوتے۔

سراب انسانی خواہشات کی شدت کا مرہونِ منت ہوتا ہے اور اس حوالے سے وہ نفسیاتی مریضوں کی جنونی کیفیت اور مصنوعی ایمان (Delusions) کے قریب ہوتا ہے۔ مریضوں کے مصنوعی ایمان کو تو ہم منطق کی رو سے غلط ثابت کر سکتے ہیں، لیکن اس نفسیاتی سراب کو غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ایک درمیانے درجے کی پروردہ لڑکی یہ باور کر لے کہ ایک دن ایک امیر شہزادہ آ کر

اس سے شادی کرے گا تو ایسا ممکن ہو سکتا ہے اور بعض دفعہ ایسا ہوا بھی ہے، لیکن عیسیٰؑ کا زمین پر واپس آ کر اسی دُنیا کو جنت بنانا بعید از قیاس ہے اور اس کا بالکل امکان نہیں۔ چاہے ہم اس یقین کو سراب کہیں یا دیوانگی کا حصہ، یہ ہمارے نقطۂ نظر پر منحصر ہے۔ مسیحا کے دوبارہ آنے کا یقین کسی لوہار کے اس ایمان سے مختلف نہیں کہ ایک دن اس کا سارا لوہا سونے میں منتقل ہو جائے گا۔ سراب کا تعلق حقیقت سے کم اور انسانی خواہشات سے زیادہ ہے۔

مذہبی عقائد کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی سچا ثابت نہیں کر سکتے، نہ صرف یہ کہ سچا ثابت نہیں کر سکتے بلکہ ہم نے صدیوں کی محنت اور ریاضت سے جو علم حاصل کیا ہے اور انسان اور کائنات کے بارے میں جن حقیقتوں کا سراغ لگایا ہے وہ عقاید ان سے بالکل لگا نہیں کھاتے۔ یہ علیحدہ بات کہ اگر ہم ان عقائد کو صحیح ثابت نہیں کر سکتے تو غلط بھی نہیں کر سکتے۔ کائنات کے راز آہستہ آہستہ ان لوگوں پر منکشف ہوتے ہیں۔ جو ان کے بارے میں تفکر اور تحقیق کرتے رہتے ہیں۔ آج بھی زندگی اور کائنات کے بارے میں سائنس بہت سے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ لیکن سائنسی نقطۂ نظر وہ واحد معتبر طریقہ ہے، جس سے ہم زندگی اور کائنات کے بارے میں حقائق اور بصیرتیں حاصل کر سکیں گے، ایسی بصیرتیں جن پر سب انسان متفق ہو سکیں۔ ہم اپنی ذات کی گہرائیوں میں اتر کر ایسی صداقتیں تلاش نہیں کر سکتے جن پر سب لوگ متفق ہوں اپنے فن کی گہرائیوں میں اتر کر ہم صرف اپنی شخصیت اور ذہن کے بارے میں جان سکتے ہیں۔

ہماری گفتگو کے اس موڑ پر کوئی کہہ سکتا ہے۔ ''اچھا اگر مذہبی عقائد، عقل اور دلیل سے ثابت نہیں ہو سکتے تو ان پر ایمان لانے میں کیا قباحت ہے؟ ان عقائد کی نہ صرف روایات طرفداری کرتی ہیں بلکہ ان سے بہت سے دکھی اور غمزدہ دلوں کو ڈھارس بھی ملتی ہے۔''

اس سلسلے میں، میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح ہم کسی شخص کو کسی بات یا عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور نہیں کر سکتے، اسی طرح ہم کسی کو ایمان نہ لانے پر بھی مجبور نہیں کر سکتے۔ لیکن اب ہم اس قسم کی باتوں سے دھوکہ نہ کھائیں گے۔ اور اپنی ناقدانہ سوچ کو معطل نہ کریں گے۔ جہالت بہر حال جہالت ہے، چاہے اس کے حق میں کتنے ہی بچگانہ دلائل کیوں نہ پیش کئے جائیں۔ زندگی کے کسی اور شعبہ میں کوئی شخص ایسی کمزور بنیادوں پر اپنی زندگی کے فیصلے نہ کرے

گا۔ لیکن مذہبی عقائد اور معاملات میں انسان اپنی عقل اور سمجھ بوجھ کو پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔

مذہبی عقائد کی بحث میں لوگ ہر قسم کے حقائق سے چشم پوشی اور بے ایمانی روا رکھتے ہیں اور الفاظ کے وہ معانی نکالتے ہیں جو بعید از قیاس ہوتے ہیں۔ مذہبی لوگ خدا کا ایک ایسا تجریدی تصور پیش کرتے ہیں جنہیں انہوں نے اپنے ذہنوں میں تخلیق کیا ہوتا ہے اور پھر مصر ہوتے ہیں کہ انہوں نے حقیقت پا لی ہے۔ اصحاب فکر جانتے ہیں کہ ایسا تصور انسان کی اپنی بے بسی اور مجبوری کے احساس کا نتیجہ ہے لیکن یہی بے بسی اور مجبوری کی زمین، خدا اور مذہب کے تصورات کے لئے بہت زرخیز ثابت ہوتی ہے۔

مذہبی عقائد کی حقیقت کی جانچ پڑتال میرے مضمون کا موضوع نہیں۔ میرا مقصد ایسے عقائد کی نفسیاتی توجیح پیش کرنا ہے اور یہ ثابت کرنا ہے کہ ان کی حیثیت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔

دلچسپ سوال یہ ہے کہ وہ کون لوگ تھے، جنہوں نے ایسے عقائد کو جنم دیا۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ زندگی اور کائنات کا غیر منصفانہ نظام دیکھ کر انسان خواہش کریں کہ کاش ایک ایسا خدا ہو جو زندگی میں انصاف نافذ کرے اور اگر اس دُنیا میں نہیں تو اگلی دُنیا میں انصاف کی فضا قائم کرے۔ لیکن یہ خیال ایک خواہش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ کاش ہمارے آباؤ اجداد نے اپنے مذہبی عقائد میں پناہ لینے کی بجائے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو قبول کرنے اور کائنات کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہوتی۔

(7)

مذہبی عقائد کو سراب کہنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ:

کیا انسانی تہذیب اور ثقافت کے بارے میں ہمارے دیگر نظریات بھی سراب نہیں ہیں؟

ہماری سیاسی اور رومانوی زندگیوں کی بنیاد جن نظریات پر ہے، کیا وہ بھی سراب نہیں ہیں؟

اور

کیا یہ نظریہ کہ ہم زندگی اور کائنات کی حقیقتوں کی تفہیم اور ادراک سائنس کے علم کے ذریعے کر سکتے ہیں، بذاتِ خود ایک سراب نہیں ہے؟

میرا خیال ہے کہ ہمیں ان سب اعتراضات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ عین ممکن ہے

کہ ایسی سوچ مذہبی عقائد کو سراب ثابت کرنے میں ممد ثابت ہو۔لیکن موجودہ مضمون میں، میں اپنی توجہ صرف مذہبی عقائد پر مرکوز کروں گا۔

میری گفتگو کے اس مرحلے پر مجھ پر بھی یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ”آثارِ قدیمہ کی کھدائی اور تحقیق کا عمل خوب سہی لیکن کوئی بھی محقق کسی ایسی کھدائی کے عمل میں شریک نہ ہوگا جس کے نتیجے میں قریبی شہر کے لوگوں کا ان گہرائیوں میں گر کر مر جانے کا اور ان کے کھنڈرات کا ان کی قبریں بن جانے کا خطرہ ہو۔

ہم مذہبی عقائد کے بارے میں زندگی کے باقی نظریات کی طرح بحث نہیں کر سکتے۔ انسانی تہذیب اور ثقافت کی عمارت ان بنیادوں پر استوار ہے اور اس عمارت کا قیام اس بات پر منحصر ہے کہ عوام کی اکثریت ان عقائد پر ایمان لائے۔

اگر انسانوں کو یہ درس دیا گیا کہ

نہ تو کوئی طاقتور اور منصف خدا اور نہ ہی کوئی روحانی دنیا موجود ہے اور نہ ہی موت کے بعد زندگی کی کوئی حقیقت ہے تو

وہ تہذیب کی سب روایات، اقدار اور قوانین کو ماننے سے انکار کر دیں گے۔

ہر شخص خودغرضانہ زندگی گزارنا شروع کر دے گا۔

طاقت کا ناجائز استعمال ہوگا۔

ظلم اور جبر کا دور دورہ ہوگا۔

معاشرے میں بدامنی پھیل جائے گی اور

انسانی تہذیب کے ارتقاء کا ہزاروں سالوں کا کام نیست و نابود ہو جائے گا۔

اگر ہم پر یہ حقیقت آشکارہ ہو بھی جائے کہ مذہب کے دامن میں سچائیاں نہیں ہیں تب بھی ہمیں اس حقیقت کو عوام سے چھپا کر رکھنا چاہئے کیونکہ اسی میں انسانیت کی بقا ہے۔اگر ہم نے قوم سے ان کے عقائد چھین لئے تو بڑا ظلم ہوگا۔ان گنت لوگ اپنی بیساکھیوں کے سہارے زندگی گزارتے ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس نے آج تک کوئی بھی بڑے کارنامے سرانجام نہیں دیے اور اگر اس نے کارنامے سرانجام دیئے بھی ہوتے، تب بھی وہ انسان کی ساری ضروریات کو پورا

انسانی شعور کا ارتقا

کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔انسان کی بہت سی نفسیاتی اور جذباتی ضروریات کا سائنس کے پاس کوئی علاج نہیں اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ ماہرِ نفسیات جو ساری عمر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ انسانی اعمال اور زندگی کے محرکات کا تعلق عقلِ سلیم سے کم اور جبلتوں اور خواہشات سے زیادہ ہے، آج انسانیت کو ان کی جبلی اور جذباتی خواہشات کی تسکین سے روک رہا ہے اور انہیں عقل کا ایسا درس دے رہا ہے جو انسانی تہذیب کی بقا کے لئے نہایت مضر ہے۔“

اگرچہ اس اعتراض پر میرے موقف اور نقطۂ نظر پر بہت سے حملے کیے گئے ہیں، لیکن میں ان کا جواب دینے کو تیار ہوں۔میری نگاہ میں انسانی تہذیب اور ارتقاء کے لئے ان مذہبی عقائد پر ایمان لانا، نہ لانے سے زیادہ خطرناک ہے۔

جب میں اپنے موقف کے حق میں دلائل پیش کرتا ہوں تو مجھے اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد رکھنے والے شخص پر ان دلائل کا کوئی اثر نہ ہوگا اور وہ میرے خیالات کی وجہ سے اپنے ایمان کو خیرباد نہ کہے گا۔مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو مجھ سے پہلے اصحابِ فکرونظر نے نہ کہی ہو۔میں نے صرف ان کے دلائل اور اعتراضات کو نفسیاتی بنیادیں فراہم کی ہیں۔کوئی مجھ سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ اگر میرے دلائل سے لوگوں کے ایمان میں فرق نہ آئے گا تو پھر مجھے اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے، میں اس سوال کا بعد میں جواب دوں گا۔

میری اس تحریر سے اگر کسی شخص کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو وہ خود میری اپنی ذات ہے۔لوگ مجھ پر تنگ نظری، سطحی پن اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی مخالفت کرنے کے اعتراضات کر سکتے ہیں، لیکن میرے لئے ایسے اعتراضات کوئی نئی بات نہیں۔مجھ جیسا شخص جس نے جوانی میں ہی اپنے ہم عصروں کی تنقید اور توصیف سے بے نیاز ہو کر اپنا کام شروع کیا تھا، وہ بڑھاپے میں کہاں قلم روک سکتا ہے۔ایک وہ زمانہ تھا جب اگر کوئی خدا یا مذہبی عقائد پر اعتراض کرتا تو اس کا دائرہ حیات تنگ کر دیا جاتا، لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔اب ایسی تحریریں نہ تو مصنف اور نہ ہی قارئین کو نقصان پہنچاتی ہیں۔زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کی طباعت، ترجمے اور تقسیم پر بعض ممالک میں پابندی لگا دی جائے اور وہ صرف وہی ممالک ہوں گے جنہیں اپنے

نظریات اور عقائد پر بڑا گھمنڈ ہوگا لیکن اگر کوئی شخص اپنی قسمت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو تو اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیے۔

اس تحریر سے ایک اور نقصان ہو سکتا ہے اور وہ نقصان ذاتی نہیں بلکہ تحلیلِ نفسی کے نقطہ نظر اور تحریک کو ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تحلیل نفسی کا مکتبہ فکر میری تخلیق ہے اور اب تک وہ بہت سے اعتراضات اور حملے سہہ چکا ہے۔ میری موجودہ تحریر سے میرے مخالفین تحلیل نفسی کو نشانۂ ہدف بنا سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں ''ہم نہ کہتے تھے کہ تحلیلِ نفسی ایک نقصان دہ نظریہ ہے۔ اب اس کا نقاب اتر گیا ہے اور واضح ہو گیا ہے کہ تحلیل نفسی کے در پردہ دہریت کا پرچار ہوتا رہا ہے اور اخلاقی اقدار سے نجات پانے کا درس دیا جاتا رہا ہے اب ہمارے سب شبہات یقین میں بدل گئے ہیں۔''

اس قسم کا اعتراض میرے لئے نہایت تکلیف دہ ہوگا کیونکہ میرے تحلیلِ نفسی کے کئی رفقاء کار میرے مذہب کے بارے میں نظریات سے اتفاق نہیں کرتے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اس قسم کے اعتراضات سے تحلیلِ نفسی کے مکتبہ فکر کو نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ اس سے پہلے بھی وہ بہت سے طوفانوں کا سامنا کر چکا ہے اور وہ اس طوفان کا بھی دلیرانہ طور پر مقابلہ کرے گا۔

میری نگاہ میں تحلیل نفسی ریاضی کی Calculus کی طرح ایک غیر جانبدارانہ طریقہ کار کا نام ہے۔ اگر ایک ماہر طبیعات اپنی Calculus کی تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچے کہ عنقریب کرہ ارض تباہ ہونے والا ہے تو کیا وہ اس نتیجے کا الزام ریاضی کے سر لگائے گا۔ میں نے مذہبی عقائد کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس نقطہ نظر کو مجھ سے اور تحلیل نفسی کی پیدائش سے بیشتر بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ تحلیلِ نفسی کے علم نے صرف اس نقطہ نظر کو چند نفسیاتی دلائل پیش کیے ہیں اور مذہبی عقائد کی سچائیوں کا تجزیہ کیا ہے۔ میرا کوئی مخالف تحلیلِ نفسی کو اپنے عقائد کو سچ ثابت کرنے کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے۔

مجھے اس حقیقت کو قبول کرنے میں کوئی عار نہیں کہ مذہب نے انسانی معاشرے اور تہذیب کے ارتقا میں گراں قدر خدمات سر انجام دی ہیں۔ اس نے انسانی جبلتوں پر پابندیاں عائد کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ میرا صرف یہ کہنا ہے کہ مذہب کی ایک صحتمندانہ اور منصفانہ معاشرہ قائم کرنے کی کوششیں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئیں۔ مذہب

انسانی شعور کا ارتقا

نے انسانی معاشروں پر ہزاروں سالوں سے حکمرانی کی ہے۔ اسے اپنے نتائج پیدا کرنے کا پورا پورا موقع ملا ہے۔ اگر اس نے بنی نوع انسان کو خوشیاں اور سکون اور ایک اعلیٰ زندگی دی ہوتی تو کوئی بھی اس پر معترض نہ ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان گنت انسان دکھی زندگی گذار رہے ہیں۔ اب لوگ زندگی کے اس موڑ پر آ گئے ہیں کہ یا تو وہ تہذیب کو بالکل بدل کر رکھ دیں گے اور یا اپنے دلوں میں مذہب اور تہذیب کے خلاف غصے اور نفرت کے طوفان لئے پھریں گے۔

بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذہب کو معاشرے کو بدلنے کا پورا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ سائنس اس کی راہ میں روڑے اٹکاتی رہی ہے لیکن میرے خیال میں یہ دلیل نہایت کمزور ہے اگر آج مذہب کی بنیادیں ہل چکی ہیں تو ہم ان دنوں کا بھی تصور کر سکتے ہیں جب مذہب کو معاشرے پر پورا اختیار حاصل تھا۔ اس دور میں بھی انسان گناہ کرتے تھے اور پادری انہیں یا تو گناہوں کی سزا دیتے تھے یا توبہ استغفار کرنے کو کہتے تھے۔ بعض روسی ماہرین کا تو کہنا ہے کہ اگر خدا کی بخششیں انسان کے کثرت سے گناہ کرنے پر منحصر ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کو انسان کا گناہ کرنا اچھا لگتا ہے۔ صدیوں سے پادری اپنی ہوس اور طاقت کے نشے میں گناہ گاروں کو معاف کرتے رہے ہیں تا کہ وہ مذہب کا دائرہ چھوڑ کر باہر نہ چلے جائیں۔ وہ یہی کہتے رہے: خدا نیک اور طاقتور ہے، جبکہ انسان کمزور اور گناہگار ہے۔ اس صورتِ حال نے انسانی معاشرے میں اچھائی کی کوئی صورت پیدا نہ کی۔

اگر ہم اپنے دور کے معاشرتی حالات کا تجزیہ کریں تو ہمیں احساس ہوگا کہ یورپ کی تہذیب پر عیسائیت کا اثر کم ہونے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ لوگوں کا مذہب سے اعتبار اٹھتا جا رہا ہے اور معاشرے کے اعلیٰ طبقوں میں سائنسی نقطۂ نظر مقبول ہو رہا ہے۔ مذہبی کتابوں اور اعتقادات کو جب تنقید اور سائنس کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان میں بہت سی کوتاہیاں اور خامیاں دکھائی دیتی ہیں اور مذہبی اعتقادات اور غیر مہذب قوموں (Primitive People) کی سوچ میں بہت سی مماثلتیں نظر آتی ہیں۔

سائنس ہمیں زندگی اور کائنات کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے پر اکساتی ہے۔ جوں جوں سائنسی رجحانات رکھنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، توں توں مذہبی عقائد پر ایمان

رکھنے والوں کی تعداد میں کمی آتی جا رہی ہے۔

انسانی تہذیب کو تعلیم یافتہ اور اصحابِ فکر لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ انہوں نے آہستہ آہستہ مذہبی عقائد اور روایات کو سیکولر نظریات سے بدلنا شروع کر دیا ہے اور انسانی تہذیب کے ارتقاء میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے مقابلے میں انسانی تہذیب کو غیر تعلیم یافتہ اور مجبور و معتوب عوام سے زیادہ خطرہ ہے۔ جب تک وہ یہ نہ جانیں کہ لوگوں نے خدا پر ایمان لانا چھوڑ دیا ہے، ہم عافیت میں ہیں۔ لیکن جلد یا بدیر انہیں اس حقیقت کی خبر ہو جائے گی۔ امید یہ ہے کہ وہ سائنسی سوچ کے نتائج کو قبول کر لیں گے لیکن اپنے اندر وہ تبدیلی پیدا نہ کریں گے جو سائنسی نقطۂ نظر رکھنے والوں کو اپنے اندر پیدا کرنی پڑتی ہے۔

اگر کسی دوسرے انسان کو قتل نہ کرنے کا واحد جواز یہ ہے کہ اسے خدا نے منع کیا ہے اور اگر کسی انسان کو یہ پتہ چل جائے کہ نہ تو خدا ہے اور نہ ہی اسے مرنے کے بعد اس کی سزا ملے گی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کا قتل شروع کر دے۔ اگر ایسا ہے تو پھر تو واقعی عوام کو ذہنی طور پر بیدار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ انسانیت کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا ورنہ مذہب اور تہذیب کے رشتے میں ایک انقلاب پیدا ہوگا۔

(8)

میرے خیال میں مذہبی عقائد کی عمارت کے ڈھے جانے سے انسانیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جو اس خیال سے ہی گھبرا اُٹھتے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ اس عمل سے انسانی تہذیب بحران کا شکار ہو جائے گی۔ مجھے اس موقع پر آٹھویں صدی عیسوی کے سینٹ بونیفس (St. Bonifice) کا واقعہ یاد آتا ہے جس نے جب گاؤں کے ایک مقدس درخت کو کاٹا تو لوگ خوفزدہ تھے کہ ان پر کوئی قیامت ٹوٹے گی۔ لیکن اس واقعہ کے بعد نہ تو کوئی عذاب آیا اور نہ ہی لوگوں کی جانیں خطرے میں پڑیں۔

جب انسانی معاشرے اور تہذیب نے یہ قانون وضع کیا کہ کسی انسان کو اپنے ہمسائے کو قتل کرنے کی یا اُس کی جائیداد پر ناجائز قبضہ کرنے کی اجازت نہیں تو اس قانون کا مقصد ایک صحتمند اور منصفانہ معاشرے کا قیام تھا کیونکہ قتل کے بعد قاتل کو مقتول کے دوست احباب کے بدلہ لینے کے جذبے کا سامنا کرنا پڑتا اور دوسرے لوگ اس سے حسد کرتے کیونکہ اس نے اُن

کے وحشی جذبات کو عملی جامہ پہنا دیا تھا اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا کہ جلد یا بدیر وہ خود بھی کسی کے ہاتھوں قتل کر دیا جاتا۔ اگر وہ کسی ایک دشمن سے بچ بھی جاتا تو کمزور عوام مل کر اسے نیست و نابود کر دیتے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی قتل و غارت کا بازار گرم ہو جانے سے معاشرے کا امن اور سکون درہم برہم ہو جاتا اور ہم ایک ایسے معاشرے میں ایک دفعہ پھر داخل ہو جاتے جہاں کسی کی جان، مال اور خاندان محفوظ نہ رہتے۔ اس وقت ہم معاشرے کے ارتقاء میں اس مقام تک آ گئے ہیں کہ دُنیا میں قوموں کی جنگوں اور قتل و غارت کے علاوہ روزمرہ زندگی میں انسانی قتل کو قبول نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی شخص قتل کا مرتکب ہو تو معاشرہ اجتماعی طور پر اس کی سزا کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس طرح معاشرے میں انصاف کا بول بالا رہتا ہے۔

لیکن جب ہم قتل کی ممانعت کی بات کرتے ہیں تو اس قسم کی منطقی دلیل پیش نہیں کرتے اور یہ نہیں کہتے کہ منصفانہ معاشرے کے قیام کے لئے قتل پر پابندی ضروری ہے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے اور پھر یہ سوچتے ہیں کہ آخر خدا نے ایسا حکم کیوں دیا ہے۔ اس طرح ہم قتل نہ کرنے کے حکم کو مقدس بناتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کے تصور کو خدا پر ایمان لانے کے تصور سے جوڑ دیتے ہیں۔ اگر ہم اس درمیانی کڑی سے نجات حاصل کر لیں اور قتل نہ کرنے کے لئے مذہبی جواز کی بجائے معاشرتی جواز پیش کریں تو ہم ارتقاء کے سفر کو ایک مقام آگے بڑھائیں گے اور انسانی مسائل کے حل کے لئے خدا کی مرضی کو تلاش نہ کرتے پھریں گے۔ کیونکہ مذاہب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف قوموں اور مختلف مذاہب میں خدا کی مرضی کو مختلف ہی نہیں، متضاد انداز میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ اور کسی انسان کے لئے ان کی صحت کی جانچ پڑتال کرنا ناممکن ہے۔ اگر ہم انسانی زندگی کے معقول اور منصفانہ قوانین آپس کے مشورے سے چاہے وہ پارلیمنٹ اور چاہے وہ قانون دانوں کے حوالے سے ہوں، تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکیں تو ہمیں اس عمل میں خدا، مذہب اور آسمانی کتابوں کو لانے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس مصنوعی تقدس سے نجات حاصل کریں اور اس بات کا اقرار کریں کہ انسانی معاشرے کے قیام اور ارتقاء کے لئے ہمیں خداؤں کی ضرورت نہیں رہی۔ اب انسان اجتماعی طور پر قوانین خود بنا سکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے وہ قوانین آسمانوں سے اتر کر زمین پر آ جائیں گے، ان میں حالات اور انسانی معاشرے کے

بدلنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی لائی جا سکیں گی اور وہ حقیقت پسندانہ بھی ہوں گے۔ ایسا کرنے سے عوام کا ان قوانین کے بارے میں رویہ بھی ہمدردانہ اور دوستانہ ہوگا اور وہ ان کے خلاف اس غصے، تلخی اور نفرت کا اظہار بھی نہ کریں گے جو وہ آسمانی قوانین کے بارے میں کرتے ہیں۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ وہ قوانین ان کے اپنے بنائے ہوئے ہیں اور ان میں ان کی اپنی بہتری مضمر ہے۔ اس طرح انسانی تہذیب کا ارتقاء نئے خطوط پر استوار ہونا شروع ہو جائے گا۔ لیکن جب انسانی معاشرے کے قوانین کی عقلی اور معاشرتی ضرورت کی دلیل پیش کرتے ہیں تو بہت سے لوگ ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانی قتل کی ممانعت کے قانون کا تاریخی جواز درست ہے؟ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ مجھے یہ ایک جذباتی مسئلے کا عقلی حل نظر آتا ہے جسے ہم تحلیل نفسی کی زبان میں Rationalization کہتے ہیں جو جذباتی مسائل پر عقل کا پردہ ڈالتا ہے۔ ہم تحلیل نفسی کے علم سے یہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب کسی انسان میں کسی کام کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے تو وہ اس کے حق میں دلائل پیش کرتا ہے۔ ایسے دلائل جن کا اس کام سے کوئی حقیقی تعلق نہیں ہوتا۔ پرانے زمانے کے انسان میں، اپنے جابر باپ کے خلاف اتنا غصہ پیدا ہو جاتا تھا کہ بعض دفعہ اس کے دل میں اپنے باپ کو قتل کرنے کے جذبات ابھرتے تھے۔ ان جذبات پر قابو پانے کے لئے معاشرے نے باپ کے قتل کی مخالفت کا قانون پاس کیا لیکن آہستہ آہستہ وہ قانون صرف باپ کے قتل کے لئے ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کے قتل کے لئے استعمال ہونے لگا۔

ہم پر انسانی تاریخ کے تجزیے سے واضح ہوا ہے کہ خدا کا تصور بھی باپ کے تصور کا رہین منت ہے۔ اس لئے کہ کہا جا سکتا ہے کہ قتل نہ کرنے کا قانون صرف معاشرتی ضروریات کے تحت وجود میں نہیں آیا بلکہ مذہبی عقائد کے مطابق یہ خدا کا حکم بھی ہے اور یہ عقیدہ تاریخی حقیقت کا بھی اظہار کرتا ہے، جبکہ ہمارے منطقی استدلال معاشرتی ضرورت کا تو اقرار کرتا ہے، خدا کی اہمیت کو نہیں مانتا۔

اب ہم مذہبی عقائد کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ عقائد صرف انسانی خواہشات کا ہی اظہار نہیں کرتے بلکہ وہ تاریخی یادداشتوں کی بھی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس طرح مذہبی عقائد کو حال اور ماضی دونوں قسم کے محرکات، طاقتور بناتے ہیں۔ ہم انسانی تاریخ

اور تہذیب کے ارتقاء کا انسانی بچے کی نشوونما سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں تحلیل نفسی کے علم نے بتایا ہے کہ بچہ بلوغت کی زمینوں کو عبور کرتے ہوئے ایک نفسیاتی طور پر غیر صحتمند نیوروٹک (Neurotic) دور سے بھی گزرتا ہے جس میں اسے اپنی جبلی خواہشات کو دبانا پڑتا ہے کیونکہ اس کا ذہن ان پابندیوں کو عقلی طور پر نہیں سمجھ سکتا اور کچھ عرصے کے لئے ان خواہشات کو لاشعور میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ اکثر بچوں کی وہ نفسیاتی گرہیں آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی کھل جاتی ہیں اور جوانی تک پہنچتے پہنچتے وہ بچے ان مسائل کا صحتمند حل تلاش کر لیتے ہیں اور وہ نوجوان جو اس دباؤ سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں وہ تحلیل نفسی کے علاج سے ایک صحتمند زندگی گزارنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ایک انسان کے جذباتی اور ذہنی مدارج کی طرح پوری انسانیت بھی ارتقاء کے مدراج سے گزر رہی ہے اور وہ بھی اپنی جہالت، کم عقلی اور بہت سے مسائل کو لاشعور میں دبا رکھنے کی وجہ سے نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گئی ہے۔ انہی الجھنوں میں مذہبی عقائد بھی شامل ہیں جنہیں انسان آج تک گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہم مذہب کو انسانیت کا عالمی نفسیاتی مسئلہ کہہ سکتے ہیں۔ (Universal Obsessional Neurosis of Huminity) بچوں کے نفسیاتی مسائل کی طرح اس کی جڑیں بھی Oedipus Complex اور بچے کے باپ کے ساتھ تضادات تک پھیلی ہوئی ہیں اور جس طرح بچوں کو جوانی تک پہنچنے کے لئے، ان مسائل اور الجھنوں کو پیچھے چھوڑنا پڑتا ہے اسی طرح انسانیت کو بھی بلوغت تک پہنچنے کے لئے مذہبی عقائد کو پیچھے چھوڑنا ہوگا۔ جس طرح ایک مشفق استاد بچوں کی تربیت میں ان کی بلوغت کے سفر میں ان کا معاون ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی ان انسانوں سے جو ان عقائد سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں، ہمدردی سے پیش آنا چاہئے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔

جب ہم مذہبی عقائد کی تاریخ سے واقف ہوتے ہیں تو ہمارے دلوں میں ان کی قدر بڑھ جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں بلوغت کے سفر کو ترک کر کے انہیں ہمیشہ کے لئے اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہئے۔ تاریخ کے مطالعہ نے ہم پر یہ بھی اجاگر کیا ہے کہ ان عقائد پر ایمان لانے میں لاشعوری محرکات نے اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ مرحلہ آ گیا ہے کہ ہم

ان لاشعوری عوامل کی بجائے اپنے شعور اور عقل پر زیادہ انحصار کریں، جس طرح ایک ذہنی مریض اپنی الجھنوں کی تفہیم کے بعد اپنا نقطہ نظر اور لائحہ عمل بدلتا ہے اور زندگی کے فیصلے عقل و دانش کی بنیادوں پر کرتا ہے۔ میری نگاہ میں یہ قدم انسانی تہذیب کے ارتقاء کے اگلے مرحلے کے لئے راہ ہموار کرے گا اور اس کے لئے مدلل اور معقول بنیادیں فراہم کرے گا۔ مذہبی عقائد اور نظریات صدیوں کے سفر کے بعد اتنا گرد و غبار سے اٹ گئے ہیں کہ ان میں سے حق اور سچ تلاش کرنا مشکل ہو گا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ جب بچے پوچھتے ہیں کہ نومولود کہاں سے آتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ وہ آسمانوں سے اترتے ہیں اور انہیں پرندے لے کر آتے ہیں۔ ہم بچوں سے تشبیہوں اور استعاروں کی زبان میں بات کرتے ہیں لیکن بچے ان تشبیہوں اور استعاروں کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں اور بڑے ہو کر جب انہیں اصل حقیقت کا ادراک ہوتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں والدین نے دھوکا دیا تھا۔ اب ہم جان گئے ہیں کہ بچوں سے استعاراتی زبان میں بات کرنے سے یہ بہتر ہے کہ ہم ان کی عقل کے مطابق انہیں زندگی کی حقیقتوں کے بارے میں بتائیں۔ یہی صورتِ حال مذہبی عقائد کو ماننے والے انسانوں کی بھی ہے۔

(9)

گفتگو کے اس مرحلے پر کوئی معترض کہہ سکتا ہے۔

''آپ کی باتیں مجموعہِ تضادات ہیں۔ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ آپ کی تحریر بے ضرر ہے اور آپ کے دلائل سے کوئی اپنا ایمان نہ چھوڑے گا۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی واضح ہے کہ آپ کی تحریر لوگوں کے دلوں میں اپنے عقائد کے بارے میں شکوک کھڑے کر رہی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسی تحریر کو چھپوانے کا مقصد کیا ہے؟

آپ نے اس بات کا بھی اقرار کیا ہے کہ بعض لوگوں کے لئے یہ تصور کہ لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور وہ سب زنجیروں اور پابندیوں کو توڑ کر شتر بے مہار کی طرح زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ آپ کے یہ کہنے سے کہ اخلاقیات اور قوانین کی عمارت کو مذہبی عقائد پر استوار کرنا تہذیب کے لئے مضر ہے، عین ممکن ہے کہ لوگ مذہب کو بالکل ہی چھوڑ دیں۔

آپ کی گفتگو میں ایک اور تضاد بھی ہے۔ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ انسانی زندگی

عقل کی نسبت جذبات اور جبلتوں کی مرہونِ منت ہے تو دوسری طرف آپ یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ انسانوں کو اپنی زندگیوں کے فیصلے جذبات کی بجائے عقل و شعور کے حوالے سے کرنے چاہئیں۔

آپ کی گفتگو سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا۔ اس سے پہلے بھی کئی معاشروں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں مذہب کی بجائے عقل اور منطق کو استعمال کریں گے، لیکن وہ سب تجربات ناکام ثابت ہوئے۔ انقلابِ فرانس اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ وہی تجربہ روس میں دہرایا جا رہا ہے اور ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ان تجربوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان مذہب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

آپ نے مذہب کو انسانیت کا ایک نفسیاتی مسئلہ قرار دیا ہے اور آپ انسانیت کو اس سے نجات دلانا چاہتے ہیں لیکن مذہب سے نجات حاصل کرنے کے عمل میں انسان کتنی قیمتی چیزوں سے محروم ہو جائے گا، اس کی طرف آپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔''

میں ان اعتراضات کے جواب میں یہ کہوں گا کہ میری گفتگو میں بظاہر تضادات شاید اس لئے نظر آ رہے ہیں کیونکہ میں نے اپنا مافی الضمیر بڑے اختصار سے پیش کیا ہے۔ اگر میں اپنے خیالات تفصیل سے لکھتا تو شاید میرا موقف واضح ہو جاتا۔ میں نے اب بھی اصرار کرتا ہوں کہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایک حوالے سے بے ضرر ہے۔ کوئی بھی ایمان رکھنے والا میرے دلائل کو سن کر اپنا ایمان نہ بدلے گا۔ ایمان رکھنے والا اپنے عقائد سے عقل کی بجائے جذبات سے جڑا ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ارد گرد بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو مذہبی عقائد کو دل سے تو نہیں مانتے، لیکن ان پر اس خوف سے عمل کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے انکار کیا تو ان کی زندگیوں کو مشکل بنا دیا جائیگا۔ انہوں نے ان مذہبی روایات کو زندگی کی دیگر تلخ حقیقتوں کی طرح قبول کر رکھا ہے۔ اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ ان عقائد کو پیچھے چھوڑ دیں۔ ایسے لوگ جب یہ دیکھیں گے کہ باقی لوگ مذہب سے خوف زدہ نہیں ہیں تو ان کے دلوں سے بھی مذہب کا خوف ختم ہو جائے گا۔ میری گفتگو کا مخاطب ایسے لوگ ہی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ معاشرے میں اس قسم کی تبدیلی آہستہ آہستہ آتی رہے گی، چاہے میری تحریریں چھپیں یا نہ چھپیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان عقل اور شعور کی بجائے جذبات اور جبلتوں کے غلام ہیں تو ہم انہیں اس جذباتی تسکین سے کیوں محروم کریں۔ میرا جواب یہ ہے کہ اگر ''ایسا ہے'' تو کیا ''ایسا ہونا چاہئے''۔ کیا یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے یا صدیوں کی تربیت کا ماحصل۔

اگر ہمیں ماہرین بشریات بتائیں کہ ایک قوم میں بچوں کے سروں پر پیدا ہوتے ہی لوہے کی ٹوپیاں پہنا دی جاتی ہیں تاکہ ان کے سر نہ بڑھ سکیں اور وہ کند ذہن رہ جائیں، تو کیا ہم ایسے انسانوں کے جاہل اور کند ذہن ہونے کو انسانی فطرت کا حصہ سمجھیں گے۔ میرے خیال میں انسانوں کا عقل اور شعور کو قبول نہ کرنے کا عمل اس مذہبی تربیت کا حصہ ہے جو انسانوں کو بچپن سے دی جاتی ہے۔ ہم بچوں کو اس چھوٹی سی عمر میں خدا، مذہب اور حیات بعد الموت کے بارے میں تصورات سکھاتے ہیں، جب اُن کی عقل انہیں سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے اور وہ انہیں بنا سوچے سمجھے قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

میری نگاہ میں ہم اپنے بچوں کے ساتھ دو طرح کی ناانصافیاں کرتے ہیں۔ ہم انہیں انسانی زندگی کے جنسی پہلو کی صحیح تعلیم سے محروم رکھتے ہیں۔ ہم انہیں مذہب کی غیر ضروری تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ ایسی تربیت سے بچوں کا ذہن اور شخصیت اس حد تک متاثر ہوتے ہیں کہ جوانی کے بعد بھی ان میں سے بہت سے اس تعلیم و تربیت کے مضر اثرات سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ وہ ہمیشہ جہنم کی آگ سے ہی ڈرتے رہتے ہیں اور عقل اور شعور استعمال نہیں کرتے۔

اگر ہم اپنی عقل اور فہم و فراست کا پورا استعمال نہ کریں گے تو ہم کیسے امید رکھ سکتے ہیں کہ انسان اپنی بلوغت تک پہنچیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں عورتوں پر بچپن سے، مردوں سے زیادہ جنسی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور انہیں جوانی میں ان پابندیوں کے مضر اثرات سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اگر کسی انسان کا بچپن جنسی ہی نہیں مذہبی پابندیوں سے بھی داغدار ہو تو اس کے ایک صحتمند زندگی گزارنے کے امکانات اور بھی کم ہو جاتے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ میں بھی ایک سراب کا پیچھا کر رہا ہوں۔

عین ممکن ہے کہ مذہبی پابندیاں اتنی نقصان دہ نہ ہوں جتنا کہ میں سمجھ رہا ہوں۔

عین ممکن ہے کہ مذہبی پابندیوں کی غیر موجودگی میں بھی انسان زیادہ عاقل بالغ اور صحتمند نہ ہوں۔

لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک بہتر مستقبل کے خواب دیکھنے چاہئیں اور انہیں شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ ایسا مستقبل جس میں انسانی بچوں کو مذہب کی غیر ضروری تعلیم نہ دی جائے گی اور وہ اپنی عقل کا پورا پورا استعمال کر سکیں گے۔ اگر ایسا کرنے کے بعد بھی انسانوں نے بہتر زندگی نہ گزاری تو میں مان لوں گا کہ انسان فطری طور پر کمزور عقل رکھتا ہے اور جبلی خواہشات کا غلام ہے۔

میں ایک حوالے سے اپنے معترض سے متفق ہوں۔ میرے خیال میں کسی معاشرے سے مذہب کو طاقت کے زور سے اور ایک ہی جھٹکے سے جدا کرنا کوئی دانشمندانہ قدم نہیں، کیونکہ اس کے نتائج غیر تسلی بخش ہوں گے۔ اگر ایسا کیا گیا تو وہ ایک ظالمانہ عمل ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے، جیسے ایک شخص جو برسوں سے بے خوابی کا شکار ہو اور رات کو سونے سے پہلے نیند کی گولیاں کھاتا ہو، وہ اچانک وہ گولیاں کھانی بند کر دے۔ مذہبی عقائد بھی بہت سے لوگوں کے لئے نشہ آور ادویہ کی طرح کام کرتے رہے ہیں اور ان کے استعمال پر یکدم پابندی عاید کرنا اپنے لئے علیحدہ مسائل کھڑے کر سکتا ہے۔

مجھے اپنے معترض کی اس بات سے اختلاف ہے کہ انسان مذہبی سراب کے بغیر زندگی کے مسائل اور حقیقتوں سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے۔ یہ صرف ان لوگوں کے لئے درست ہو سکتا ہے، جو بچپن سے مذہب کے کڑوے میٹھے زہر پر پلے ہوں اور ان کے لئے اس سے نجات پانا ناممکن ہو۔ لیکن وہ لوگ جن کی پرورش صحتمند اور آزاد خیال ماحول میں ہوئی ہے، انہیں اس زہر اور اس سراب کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ زندگی کے حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس بڑے کارخانہ حیات میں ان کی حیثیت کیا ہے وہ اپنے آپ کو کائنات کا مرکز اور خداؤں کا چہیتا نہیں سمجھتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایسے خیالات سے بچپنا جھلکتا ہے۔ انسان بچپن میں اپنے آپ کو والدین کا منظور نظر سمجھتے ہیں، لیکن جب وہ بالغ ہو کر زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہوتے ہیں تو ان کا رویہ حقیقت پسندانہ ہو جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک بالغ اور صحتمند زندگی گزارنے کے لئے اپنے والدین سے آزادی اور خودمختاری حاصل کرنا ان کے لئے بہت اہم ہے۔

میری اس کتاب کا مقصد انسانوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے تاکہ وہ زندگی میں بلوغت کے

زینے پر اگلا قدم اٹھا سکیں اور بہتر مستقبل کی طرف سفر جاری رکھ سکیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسان اس امتحان میں کامیاب نہیں ہوگا، لیکن میں ان سے متفق نہیں۔ کیوں نہ ہم یہ امید رکھیں کہ انسان اس مرحلے کو بھی ماضی کے دیگر مراحل کی طرح خوش اسلوبی سے نبھائے گا۔ جب انسان کو نئے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان کا حل بھی تلاش کر ہی لیتا ہے اور اب تو انسان اکیلا بھی نہیں، اب اسے سائنسی علم اور تحقیقات کی مدد بھی حاصل ہے۔

میری نگاہ میں چاند پر بستیاں آباد کرنے کے خوابوں سے زمین پر ایسا چھوٹا سا باغ لگانا جو ہماری ضروریات کے لئے کافی ہو، زیادہ حقیقت پسندانہ عمل ہے۔ اگر انسانوں نے اگلے جہانوں سے بے جا امیدوں کو چھوڑ کر اسی دنیا میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا شروع کیا تو انسانی زندگی میں ایک توازن پیدا ہوگا اور وہ انسانی تہذیب کے ارتقاء میں ایک اہم کردار ادا کر سکیں گے۔

(10)

گفتگو کے اس موڑ پر معترض کہہ سکتا ہے۔

"آپ ایک ایسے معاشرے کی امید لگائے بیٹھے ہیں، جس میں لوگ سرابوں سے جی نہ بہلائیں گے اور مذہبی عقائد کو ترک کر کے عقل و دانش سے اپنی زندگی کے فیصلے کریں گے۔ میری نگاہ میں آپ خود ایک سراب کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اگر آپ خود عقل سے کام لیتے تو ایسی امیدوں سے دستبردار ہو جاتے۔ آپ کی امیدیں آپ کی اپنی خواہشوں کی شدت کی عکاسی کرتی ہیں۔ آپ کو یہ خوش گمانی ہے کہ ہم انسانی معاشرے میں ایسا ماحول پیدا کر سکیں گے، جہاں نسل در نسل بچے مذہبی عقائد کے سائے میں پرورش نہ پائیں گے اور جوان ہو کر اپنی جبلتوں اور خواہشات کی بجائے عقل، منطق اور فہم و فراست کو اپنا رہنما بنائیں گے۔ میری نگاہ میں یہ بھی ایک سراب ہے کیونکہ انسانی فطرت کو بدلنے کی امید رکھنا، خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر ہم ان قوموں کا مطالعہ کریں جہاں خدا کے تصور کا کوئی وجود نہیں، وہاں بھی لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔ اگر آپ یورپی تہذیب سے مذہبی نظام کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی اور نظام کا سہارا لینا پڑے گا اور آپ حیران ہوں گے کہ وہ نظام بھی مذہبی نظام کی خصوصیات اختیار کرنا شروع کر دے گا کیونکہ مذہبی نظام کی خصوصیات عوام کی نفسیاتی

ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ نیا نظام بھی مذہبی نظام کی طرح لوگوں کی سوچ، جذبات اور زندگیوں پر پابندیاں لگائے گا تاکہ وہ نظام خوش اسلوبی سے چل سکے۔

آپ اس حقیقت کو تو مانتے ہیں کہ ایک صحتمند معاشرے کے قیام کے لئے انسانوں کی تعلیم و تربیت نہایت ضروری ہے۔ اگر بچوں کی کی صحیح خطوط پر پرورش نہ کی گئی تو ان میں سے اکثریت گمراہی کا راستہ اختیار کر لے گی۔ مذہبی نظام اسی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انسانی زندگیوں اور ذہنوں کو خاص انداز میں ڈھالتا ہے تاکہ وہ جوان ہو کر ایک ذمہ دار شہری کی ذمہ داریاں قبول کر سکیں۔

انسان بچپن میں اپنا برا بھلا نہیں جانتا۔ وہ اپنی خواہشوں اور جبلتوں پر عمل کرتا ہے اس کا ذہن اتنا تربیت یافتہ نہیں ہوتا کہ وہ زندگی کے مسائل کا معروضی انداز میں جائزہ لے سکے۔ انسان کو بچپن کے چند سالوں میں انسانیت کے ہزاروں سالوں کے اسباق سیکھنے ہوتے ہیں اور اسی تعلیم و تربیت اور پرورش میں اس کے بزرگ اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس پرورش میں جذباتی محرکات عقلی محرکات کی نسبت زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

میرے خیال میں مذہبی عقائد کے نظام کے دفاع میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس نظام نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعلیم و تربیت اور ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ چونکہ ہمیں بچوں کی تربیت کے لئے انہیں ایک نظام سے متعارف کرانا ضروری ہے، اس لئے میرے خیال میں مذہبی نظام باقی نظاموں سے بہتر ہے اور اگر اس نظام سے انسان کی جذباتی اور نفسیاتی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں تو اس میں خرابی کی کیا بات ہے۔ جس حقیقت کی تلاش کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ نجانے انسان کی بساط میں ہے بھی کہ نہیں، چاہے وہ کوئی بھی نظام اختیار کیوں نہ کرے۔

مذہب کا وہ پہلو جو میری نگاہ میں اہم ہے وہ یہ ہے کہ وہ وحشی انسان کو مہذب انسان بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ایسے نظریات بھی پیش کرتا ہے، جن کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر سائنس ان کی تائید نہیں کرتی تو ان کی تردید بھی نہیں کرتی ایسے نظریات عوام اور خواص کے درمیان ایک پل کا کام کر سکتے ہیں۔ اگر اصحاب فکر و نظر مذہب کے ان حصوں کو قبول کر لیں تو اس سے عوام میں خبر نہیں پھیلے گی کی خواص نے "خدا پر ایمان لانا چھوڑ دیا ہے۔"

میرے خیال میں آپ کی ایک ایسے نظام کو جو صدیوں سے چلتا چلا آ رہا ہے اور لوگوں کو جذباتی تسکین فراہم کرتا ہے، ایک ایسے نظام سے بدلنے کی خواہش جس کی نہ تو افادیت ثابت ہو پائی ہے اور نہ ہی وہ جذباتی تسکین فراہم کرتا ہے، بذاتِ خود ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔"

ان اعتراضات کے جواب میں، میں معترض سے کہوں گا کہ مجھے، آپ کے اعتراضات پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا کیونکہ عین ممکن ہے کہ میں بھی ایک سراب کا پیچھا کر رہا ہوں۔ لیکن آپ کے رویے اور میرے رویے میں ایک بنیادی فرق ہے۔

میرے سراب کو اگر کوئی نہ مانے تو مذہبی عقائد کے سراب کی طرح اس پر کوئی سزا لازم نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ میرے نظریات میں یہ کوئی دعویٰ نہیں کہ وہ حتمی ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ میرے نظریات سائنسی نقطۂ نظر پر مبنی ہیں جن کی مبادیات میں یہ شامل ہے کہ جوں جوں حالات بدلتے ہیں اور ہمارا زندگی کے بارے میں علم، تجربہ اور تحقیق بڑھتے ہیں، ہمارے نظریات میں ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔

ایک ماہرِ نفسیات کے حوالے سے میں نے اپنی عمر کا ایک طویل حصہ انسانی نفسیات کو سمجھنے میں گزار دیا۔ میں نے انسانی شخصیت کو بچپن سے جوانی تک بلوغت کے مختلف مراحل سے گزرتے دیکھا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جن مراحل سے ہر انسان انفرادی طور پر چند سالوں میں گزرتا ہے، انہی مراحل سے انسانیت اجتماعی طور پر صدیوں میں گزرتی ہے۔ لیکن جس طرح بہت سے بچے بلوغت کے مراحل طے کرتے ہوئے، عارضی طور پر نفسیاتی مسائل اور الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن پھر وہ ان کا حل تلاش کر لیتے ہیں۔ اسی طرح میں بنی نوع انسان سے بھی پر امید ہوں کہ وہ مذہبی عقائد کے نفسیاتی مسائل کا حل تلاش کر لیں گے اور انہیں پیچھے چھوڑ کر بلوغت کے زینے عبور کرتے ہوئے ایسے معاشرے کو قائم کریں گے جہاں وہ مذہب کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں گے اور سیکولر نظریات کی بنیادوں پر انسانی معاشرے کی عمارت کھڑی کر سکیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میری خوش فہمی ہو لیکن میں ذاتی طور پر اس سلسلے میں بہت پُر امید ہوں۔

اس تبادلۂ خیال میں، میں مزید دو پہلوؤں پر اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ اگر میرا موقف کمزور ہے تو اس سے آپ کا موقف خود بخود طاقتور نہیں

ہو جاتا۔ میری نگاہ میں آپ ایک ہاری ہوئی بازی کھیل رہے ہیں۔ یہ بات درست بھی ہوسکتی ہے کہ انسانی عقل کی آواز اس کی جبلتوں اور جذبات کی آوازوں سے کمزور ہوتی ہے لیکن اس کی کمزوری میں بھی ایک قوت پوشیدہ ہے کیونکہ وہ نظر انداز ہونے کے باوجود اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ اور انسان کے جذباتی فیصلوں اور خطاکاریوں کے بعد اپنی بات منوا کر چھوڑتی ہے اور ثابت کرتی ہے کہ انسان کو اپنے مسائل کا حل اپنی جبلتوں اور خواہشات کی بجائے فہم وفراست اور عقل و دانش کی روشنی میں تلاش کرنا چاہئے۔ عقل و دانش کی بات کی کامیابی کے لئے دیر ہے اندھیر نہیں۔ عقل و دانش کا نظام بھی انسانیت کے لئے احترامِ آدمیت کا تحفہ لے کر آئے گا، جس کی مذہبی لوگ خدا سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ ایک حوالے سے ہمارے مقاصد ایک ہی ہیں۔ ہماری منزل ایک ہے، لیکن راستے جدا ہیں۔ ہم اپنی محنتوں کا پھل قیامت کی بجائے اگلی نسلوں میں پانے کے متمنی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جوں جوں ان محنتوں کے پھل ہمارے سامنے آتے جائیں گے، مذہبی عقائد کی عوام کے ذہنوں سے گرفت کم ہوتی جائے گی، کیونکہ تجربات اور عقل کے سامنے عقائد کی فوجیں پسپا ہو جائیں گی۔ سائنس کے آگے آہستہ آہستہ مذہب گھٹنے ٹیک دے گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر مذہبی سراب کی حقیقت واضح ہو جائے اور لوگ اپنے ایمان سے دستبردار ہو جائیں تو ان پر ایک قنوطی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور مذہب کی پوری عمارت دھڑام سے نیچے گر جاتی ہے اور مذہبی لوگ انسانیت کے مستقبل سے مایوس ہو جاتے ہیں۔

لیکن ہم ایسی مایوسی اور ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے۔ ہم نے اپنے بلوغت کے سفر میں بچپن کے مذہبی عقائد کے سراب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ سائنسی علم اور تحقیق ہمیں زندگی کی تفہیم میں مدد کریں گے، جن سے ہماری طاقت میں اضافہ ہوگا اور ہم زندگی کے مسائل سے بہتر طور پر نبرد آزما ہو سکیں گے۔ اگر ہمارا ایمان بھی سراب ہے تو ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں لیکن سائنس کی تحقیقات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہم سراب کا پیچھا نہیں کر رہے۔

سائنس کے کئی دشمن ہیں۔ بعض سامنے سے حملہ کرتے ہیں، بعض چھپ کر۔ بعض دشمن سمجھتے ہیں کہ سائنس نے مذہبی عقائد کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ سائنس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے زندگی کے صرف چند پہلوؤں میں کامیابیاں حاصل کی ہیں لیکن سائنس کی چھوٹی

سی عمر میں اتنی کامیابیاں بھی نہایت حوصلہ افزا ہیں۔ انسانی عقل نے تھوڑے ہی عرصے میں نجانے کتنے کارنامے سرانجام دے دیے ہیں۔ بعض لوگوں کا سائنس پر یہ اعتراض ہے کہ وہ ایک قانون آج پیش کرتی ہے اور کچھ عرصے کے بعد اس کی تردید بھی خود ہی کرتی ہے۔ لیکن یہ اعتراض حقیقت اور سچائی پر مبنی نہیں۔ سائنسی تحقیقات حقائق سے آہستہ آہستہ پردے اٹھاتی ہیں۔ وہ کوئی انقلاب نہیں لاتیں۔ یہ بات درست ہے کہ زندگی کے بعض شعبوں میں سائنس ابھی بچپن کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ لیکن بعض شعبے ایسے بھی ہیں جن میں اس نے ٹھوس علم کی عمارت ٹھوس بنیادوں پر استوار کر دی ہے، ایسا علم جسے دُنیا کے کسی کونے میں کوئی بھی شخص درست ثابت کر سکتا ہے۔

بعض لوگوں کا سائنس پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اس کے نتائج انسانی ذہن کی اختراع ہیں اور ان کا خارجی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن یہ اعتراض بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ انسانی ذہن کچھ اس نوعیت کا ہے کہ وہ خارجی حقیقتوں اور زندگی کے مسائل کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھ سکے اور معروضی نتائج اخذ کر سکے۔ ایسے نتائج جن کی بنیاد پر ہم ایک بہتر زندگی کو تشکیل دے سکیں۔

آخر میں، میں صرف اتنا کہوں گا کہ میری نگاہ میں سائنس سراب نہیں ہے، البتہ یہ امید کہ جو ہم سائنس سے حاصل نہیں کر سکے وہ کسی اور طریقہ سے حاصل کر لیں گے، ایک سراب ہے۔

مذہب اور روحانیات

ڈاکٹر خالد سہیل

کیا ہر ثقافت کا کوئی مذہب ہوتا ہے؟

کیا ہر معاشرے میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے؟

کیا ساری دنیا کے روحانی لوگ مشترک اقدار رکھتے ہیں؟

کیا تصوف ایک فلسفہ ہے، روحانی تجربہ ہے یا طرز زندگی؟

کیا کوئی شخص خدا اور مذہب کو مانے بغیر بھی درویش بن سکتا ہے؟

یہ چند ایسے سوال ہیں جو مذہب، سائنس اور نفسیات کا طالبعلم ہونے کے ناطے میرے ذہن میں بار بار ابھرتے رہے اور میں ان کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

جب ہم مختلف معاشروں کی مذہبی، روحانی اور سیکولر روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف قوموں میں ایک ہی لفظ کے مختلف معانی پائے جاتے ہیں اور ایک ہی عقیدے کی مختلف تفسیریں کی جاتی ہیں۔ علم و آگہی کے بڑھنے کی وجہ سے ہم ماضی کے تجربوں کا نئے انداز سے مشاہدہ اور تجزیہ کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ تاریخی اور معاشرتی فرق کے باوجود مختلف ثقافتوں میں بہت سی اقدار آج بھی مشترک ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف اقوام کی مذہبی، روحانی اور سیکولر اقدار کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ اس گفتگو کا ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ ہم مذہب کے تصور سے کیا مراد لیتے ہیں۔

جب ہم کسی روایتی مذہب کا نام لیتے ہیں تو ہمارے ذہن میں خدا، پیغمبروں، آسمانی کتابوں، قیامت، جنت و دوزخ، عبادت گاہوں اور مذہبی رہنماؤں کے تصورات ابھرتے ہیں۔ ایسے مذاہب عالم کی مثالیں اسلام، عیسائیت اور یہودیت ہیں۔ روایتی مذاہب کے

تصور میں بدھ ازم، جین ازم اور کیموزم شامل نہیں ہوتے کیونکہ ان روایتوں میں خدا کا تصور موجود نہیں ہے۔

جیفری پیرنڈر Geoffery Parrinder لکھتے ہیں 'بدھ ازم کی طرح جین مذہب میں بھی خالق خدا کا تصور موجود نہیں ہے' (Ref 1) لیکن اگر زندگی کا ہر فلسفہ مذہب کہلایا جا سکتا ہے تو پھر بدھ ازم اور کیموزم بھی مذاہب کہلائے جا سکتے ہیں یہ علیحدہ بات کہ بدھا اور مارکس کے پیروکار اسے اپنی توہین سمجھیں گے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا فلسفہ روایتی مذہب سے مختلف ہی نہیں اس کی ضد بھی ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ بدھ ازم ایک فلسفے کے طور پر شروع ہوا تھا لیکن پھر تنزل کی راہ اختیار کرتے کرتے مذہب بن گیا۔ مارکس بھی اندھے ایمان کے خلاف تھا اور مذہب کو افیون سمجھتا تھا۔

مذہبی دنیا میں بعض لوگ مذہب کے سماجی اور معاشرتی پہلو organization/ institution پر زور دیتے ہیں اور بعض اس کے نفسیاتی اور روحانی پہلو پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ صوفیا وہ لوگ ہیں جو خدا سے بلاواسطہ تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں کسی مولوی، پادری یا ربائی کی وساطت سے نہیں۔ صوفیا زندگی کے بارے میں غوروخوض کرتے ہیں اور کائنات کے اسرار ورموز جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ صوفیا مولویوں کی طرح تبلیغ اور تقریریں کرنے سے احتراز کرتے ہیں اور خاموشی سے اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔

Lewis لوئس کا خیال ہے کہ تمام مذاہب عالم میں روحانیت کا پہلو موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ایسا مذہب تلاش کرنا مشکل ہے جس کے مرکز میں خدا سے قربت کا تصور نہ پایا جاتا ہو۔ وہ لوگ جو روحانیت کی راہ پر چل نکلتے ہیں مختلف معاشروں میں سنت، سادھو، صوفی، سائیں، قلندر اور درویش کہلاتے ہیں۔ (Ref 2)

روحانیت کی روایات

جب ہم روحانیت کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں تین جداگانہ روایات ملتی ہیں۔

1- ہمہ از اوست کی روایت Theistic Tradition

اس روایت کی پیروی کرنے والے لوگ ایک ایسے خالق اور مالک خدا کا تصور رکھتے ہیں

جو اس کائنات سے جدا ہے لیکن اس سے براہِ راست تعلق قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام کو ماننے والے کئی صوفی اس روایت کو ماننے والے ہیں۔

2- ہمہ اوست کی روایت Monistic Tradition

اس روایت کو ماننے والے کائنات سے جدا کسی خدا کو نہیں مانتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو موجود ہے خدا ہے۔ اسی لئے ان کا خدا آسمانوں پر نہیں انسانوں کے دلوں میں بستا ہے اور لوگ اس سے بلاواسطہ تعلق قائم کر سکتے ہیں۔ ہندوازم کے کئی سنت اور سادھو اس روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔

3- سیکولر روایت Secular Mysticism

اس روایت کو ماننے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہر انسان کی شخصیت کا ایک پہلو درویشانہ ہوتا ہے اور اس کو پروان چڑھانے کے لئے کسی خدا یا مذہب کو ماننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس روایت کو ماننے والے فطرت سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور اپنی ذات کی گہرائیوں پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ مشرق میں بہت سے بدھا، کنفیوشس اور شنتو کے پیروکار اور مغرب میں انسان دوستی humanism کے فلسفے کو ماننے والے اس روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہو سکتا ہے بعض لوگوں کی نگاہ میں ان روایتوں کا فرق اہم نہ ہو لیکن روحانیت کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مختلف ادوار میں بہت سے درویشوں نے اپنے نظریات اور طرزِ زندگی کی وجہ سے بہت سی صعوبتیں برداشت کیں۔ بہت سے مسلم صوفیا نے جب ہمہ اوست کا فلسفہ اپنایا تو ہمہ از اوست کے فلسفے کو ماننے والوں نے یا انہیں جیل بھیج دیا یا سولی پر چڑھا دیا۔ منصور حلاج کے بارے میں کون نہیں جانتا جن کا نعرہ اناالحق انہیں تختۂ دار تک پہنچانے کے لئے کافی تھا۔

سیکولر درویش فطرت سے خاص تعلق رکھتے ہیں اور اپنی شخصیت کے روحانی پہلو کی تربیت پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں ہماری روحانیت انسانیت کا حصہ ہے خدائی کا نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سیکولر روحانیت کیا ہے؟ بدھا کا کہنا ہے کہ روحانی دنیا نام اور ہیئت سے ماورا ہے۔ (Ref 3) کرشنا مورتی کا خیال تھا کہ سچائی کی دنیا میں نہ کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی رہبر۔ ہر شخص کو اپنے انداز سے اپنا سچ اور اپنی روحانیت تلاش کرنی ہوگی۔

مادی دنیا میں چیزوں کے نام ہوتے ہیں اور وہ کسی زمان و مکان کی پابند ہوتی ہیں۔ روحانیت کا پیروکار ان تمام پابندیوں کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ جب ہم حافظ' رومی' بابا فرید' بلھے شاہ' ولیم بلیک' کبیر داس اور والٹ وٹمین کی شاعری پڑھتے ہیں تو ہمیں اس دنیا کی چند جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس دنیا کے بارے میں روایتی منطقی انداز سے گفتگو کرنا مشکل کیا ناممکن ہے۔

تاریخی حوالے سے روحانی دنیا میں کئی روایات نے فروغ پایا ہے۔ بعض نے رہبانیت کی ترغیب دی ہے اور ترکِ دنیا کا سبق پڑھایا ہے اور بعض نے زندگی اور معاشرے سے کنارہ کشی کو معیوب سمجھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان اپنے خاندانوں اور معاشروں میں رہ کر بھی روحانی منازل طے کر سکتے ہیں۔

بدھا نے نوجوانی میں جنگل کا سفر کیا تھا لیکن نروان حاصل کرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں لوٹ آئے تھے اور دوسروں کو روحانیت اور سچ کی تلاش کا درس دینا شروع کر دیا تھا تاکہ وہ اپنی دانائی دوسروں تک پہنچا سکیں اور خدمتِ خلق کر سکیں۔ بدھا کا کہنا تھا کہ اپنے سچ کی تلاش اور خدمتِ خلق ایک ہی روحانی حقیقت کے دو رخ ہیں۔

درویشانہ شخصیت

ایک نفسیات کے طالب علم ہونے کے ناطے میں روحانیت کے مذہبی اور فلسفیانہ پہلوؤں کی نسبت اس کے نفسیاتی پہلو میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں مختلف درویشوں کی سوانح عمریاں پڑھتا رہا ہوں تاکہ یہ جان سکوں کہ روحانیت کا رستہ اختیار کرنے کے بعد ان کے طرزِ زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں۔ میرا خیال ہے کہ اکثر درویشوں کی شخصیت میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

1- قناعت

درویش قناعت پسند انسان ہوتے ہیں۔ انہیں اس حقیقت کا احساس ہو جاتا ہے کہ بہت سے لوگ اس مادی دنیا میں اپنی حرص کی وجہ سے دکھی رہتے ہیں۔ وہ حریص لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کے پاس بڑا سا گھر' بہت سی کاریں اور کشتیاں' عیاشی کا سامان اور بینک میں بہت سے

ڈالر ہوں گے تو وہ خوش ہوں گے لیکن درویش جانتے ہیں کہ وہ سب سراب ہے۔ جب کوئی شخص حریص ہو جاتا ہے تو وقت کے ساتھ ساتھ اس کی حرص کم ہونے کی بجائے بڑھتی جاتی ہے۔ پہلے وہ ہزاروں ڈالر جمع کرتا ہے پھر وہ لکھ پتی بننا چاہتا ہے پھر کروڑ پتی۔ درویش یہ راز جان لیتے ہیں کہ زندگی ایک سمندر ہے اور انسانی دل ایک کشتی۔ جب تک کشتی میں سوراخ نہ ہو وہ تیرتی رہتی ہے لیکن جوں ہی اس کے پیندے میں سوراخ ہو جاتے ہیں اور پانی اندر آنا شروع ہو جاتا ہے تو اندر آنے والا تھوڑا سا پانی سمندر کے لامتناہی پانی سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے اور کشتی کو لے ڈوبتا ہے۔ جب لوگوں کے دلوں میں کسی بھی چیز کی حرص داخل ہو جاتی ہے تو وہ انہیں پریشان رکھتی ہے۔

درویش سمجھتے ہیں کہ ان کی دولت اور ان کے بچے ان کے نہیں ہیں وہ زندگی کی امانت ہیں۔ بدھا نے کہا تھا' جب انسان کی اپنی ذات بھی اس کی اپنی نہ ہو تو دولت اور بچے کیسے اس کے ہو سکتے ہیں'۔

خلیل جبران نے اپنی کتاب 'پیغمبر' (Prophet (Ref 4) میں لکھا ہے

'ایک عورت جس نے اپنے بچے کو گود میں اٹھایا ہوا تھا پوچھا' ہمیں بچوں کے بارے میں بتاؤ'
اس نے کہا' تمہارے بچے تمہارے نہیں ہیں
یہ زندگی کی امانت ہیں
انہیں اپنی محبت دو مگر اپنے خیالات نہ دو
کیونکہ ان کے اپنے خیالات ہیں
تم ان کے جسموں کا خیال رکھ سکتے ہو روحوں کا نہیں
ان کی روحیں فردا کے لئے ہیں جہاں تک تمہاری رسائی نہیں
خوابوں میں بھی نہیں'

بہت سے ایسے درویش جنہوں نے دنیاوی زندگی کو خیرباد کہہ کر درویشانہ زندگی اختیار کی ان میں ابراہیم ادھم بھی شامل تھے۔ وہ معرفت کی راہ اختیار کرنے سے پہلے بہت مالدار تھے۔ کہاوت ہے کہ ایک رات وہ محل میں سو رہے تھے کہ محل کی چھت پر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ انہوں نے باآواز بلند پوچھا

'چھت پر کیا کر رہے ہو؟'

'میں اپنا کھویا ہوا اونٹ تلاش کر رہا ہوں'

ابراہیم ادھم ہنسے اور کہنے لگے 'کیا کبھی کوئی اونٹ چھت پر بھی ملتا ہے'

وہ شخص بھی زور سے ہنسا اور بولا 'اور کیا خدا بھی محلوں میں ملتا ہے'

اگلے دن ابراہیم ادھم نے محل کو خدا حافظ کہا اور معرفت کی تلاش میں جنگل کی طرف چل دیے۔

2- منکسر المزاجی

درویش منکسر المزاج ہوتے ہیں۔ وہ انسانوں کا احترام کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو ان کے نام، خاندان اور دولت کی بجائے ان کے کردار کی وجہ سے پرکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سب انسان برابر ہیں۔ وہی انسان بہتر ہیں جن کا کردار اعلیٰ ہے۔ درویش رنگ، نسل اور زبان کے تعصبات سے بالاتر ہوتے ہیں۔ درویش لوگوں پر مولویوں کی طرح فتوے لگانے کی بجائے ان کو خامیوں سمیت قبول کرتے ہیں اور دل سے لگاتے ہیں۔

ایک کہاوت ہے کہ ایک محل میں ایک وزیر رہتا تھا۔ وہ ہر رات سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں جانے سے پیشتر ایک کوٹھڑی میں جاتا تھا۔ لوگوں کو پتہ نہ تھا کہ اس کوٹھڑی کا راز کیا ہے۔ جب وہ وزیر مرنے لگا اور لوگوں نے راز پوچھا تو وزیر نے کہا کہ ایک زمانے میں وہ گداگر ہوا کرتا تھا۔ اس نے اس کوٹھڑی میں وہ گدڑی سنبھال کر رکھی تھی اور ہر رات سونے سے پہلے دیکھتا تھا تاکہ وہ مغرور اور متکبر نہ ہو جائے۔ اس وزیر کی منکسر المزاجی نے ساری قوم کا دل موہ لیا تھا اور وہ اس کا احترام کرتے تھے۔ سعدی شیرازی فرماتے ہیں۔

ایک بارش کا قطرہ
جب سمندر کے پاس آیا تو شرمندہ ہوا
سوچنے لگا
میں اس سمندر کے آگے کتنا ناچیز ہوں
اس قطرے کی ندامت دیکھ کر
ایک سیپ کو اس پر پیار آیا
اور بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا (Ref 5)

اس طرح وہ قطرہ اپنی منکسر المزاجی کی وجہ سے موتی بن گیا۔ درویش جانتے ہیں کہ انسان کی اپنی انا اس کی معرفت کے سفر کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔

3- عذاب وثواب سے بالاتر

بہت سے عام لوگ بچوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ اچھے کام کریں تو اس کی جزا چاہتے ہیں اور برے کام کریں تو سزا کی امید رکھتے ہیں۔ جو لوگ معرفت کی منزلیں طے کر چکے ہوتے ہیں وہ بڑے مقاصد کے لئے چھوٹے مقاصد اور بڑی خوشیوں کے لئے چھوٹی خوشیاں قربان کر سکتے ہیں۔ بعض لوگ اس دنیا میں یہ سوچ کر قربانیاں دیتے ہیں تاکہ اخروی زندگی میں جنت میں جا سکیں اور جہنم سے بچ سکیں۔

درویش معرفت کی اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں انہیں نہ تو جنت کی خواہش ہوتی ہے نہ جہنم کا خوف۔ ایک کہاوت ہے کہ ایک دفعہ رابعہ بصری ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے میں پانی لئے جا رہی تھیں۔ کسی نے پوچھا آپ کہاں جارہی ہیں۔ کہنے لگیں آگ سے جنت کو آگ لگانے اور پانی سے جہنم کی آگ بجھانے تاکہ لوگ کوئی بھی نیکی جنت کی طمع اور جہنم کے خوف سے نہ کریں۔

4- من کا سکون

درویش اس طرح زندگی گزارتے ہیں کہ ان کے دلوں سے حزن، پریشانی اور دکھ نکل جاتے ہیں اور من میں آشتی اور سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ساری دنیا کو تو نہیں بدل سکتے لیکن خود کو بدل سکتے ہیں۔ وہ زندگی کو قبول کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ ان کی گفتار و کردار کے تضادات آہستہ آہستہ کم ہوتے جاتے ہیں۔ وہ چونکہ خود پرسکون ہوتے ہیں ان کی قربت میں باقی لوگ بھی پرسکون محسوس کرتے ہیں۔ بدھا نے کہا تھا 'اگر کوئی انسان خلوصِ دل سے گفتگو اور کام کرتا ہے خوشی اور سکون اس کا سایہ بن جاتے ہیں' (Ref 3)

5- خدمتِ خلق

درویش لوگ روایتی مذہبی لوگوں کی طرح تبلیغ نہیں کرتے بلکہ خدمتِ خلق کرتے ہیں۔ وہ جس چیز پر ایمان رکھتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔

درویشوں کی دلوں میں انسانیت کی ہمدردی ہوتی ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں

کے دکھ کم کریں اور وہ اس خدمت میں چھوٹے بڑے اور امیر غریب کی تمیز نہیں کرتے۔ وہ انسان دوست ہوتے ہیں اس لئے ان سے دوسرے انسانوں کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔

مدر ٹریسا (Mother Teresa) کلکتے میں ان تمام لاوارثوں کی خدمت کرتی تھیں جو کلکتے کی گلیوں اور بازاروں میں موت کا انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ وہ انہیں اپنے گھر لے آتی تھیں کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ کسی انسان کو اکیلے نہیں مرنا چاہیے۔ کسی نے پوچھا تھا کہ آپ ایسا کیوں کرتی ہیں تو وہ کہنے لگیں مجھے ان لاوارثوں کے چہرے میں عیسیٰ نظر آتے ہیں۔ شاید اسی لئے مدر ٹریسا کی شخصیت میں مسیحائی کوٹ کوٹ کر بھر گئی تھی۔ والٹ وٹمین Walt Whitman' جو امریکہ کے درویش شاعر تھے وہ بھی جنگ کے دوران واشنگٹن کے ہسپتال جاتے تھے اور بیمار سپاہیوں کا خیال رکھتے تھے۔ والٹ وٹمین کی ہمدردی اور مسیحائی صرف اپنی قوم کے لوگوں تک محدود نہ تھی بلکہ ساری انسانیت کے لئے تھی۔ ان کی ایک نظم ہے....

میرے سامنے میرے دشمن کی لاش پڑی ہے۔
وہ بھی انسان ہے' میری طرح مقدس انسان
میں اس پر جھکتا ہوں اور
اس کی پیشانی کو بوسہ دیتا ہوں

(Ref 6)

درویشوں کو اپنے دشمنوں میں بھی انسان نظر آتے ہیں۔

6- مذہبی اداروں کو چیلنج کرنا

بہت سے درویشوں کا خیال ہے کہ مولویوں' پنڈتوں اور پادریوں نے مسجدیں' گرجے اور مندر بنا کر معرفت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ انسانوں کو اپنا سچ تلاش کرنے کے لئے ان مذہبی رہنماؤں اور اداروں کی ضرورت نہیں۔ ایسے رہنما مذاہب اور عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ چنانچہ درویش عوام کو بتاتے ہیں کہ ان مولویوں' پنڈتوں اور پادریوں کی پیروی نہ کرو۔ جب روایتی مذہبی رہنما ان درویشوں کی غیر روایتی باتیں سنتے ہیں تو سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ کبیر داس کہتے ہیں۔

او برہمن
میں صرف وہ کہتا ہوں جو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں

اور تم
آنکھیں بند کر کے آسمانی کتابیں دہراتے رہتے ہو
میں زندگی کی گتھیاں سلجھانا چاہتا ہوں
تم انہیں مزید الجھانا چاہتے ہو
ہم ایک دوسرے کے ساتھ کیسے مکالمہ کر سکتے ہیں

(Ref 7)

جب برہمنوں' پادریوں اور مولویوں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سنت' سادھو اور درویش مذہبی روایات اور توہمات کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو وہ درویشوں کے خلاف ہو جاتے ہیں اور انہیں طرح طرح سے اذیتیں اور تکلیفیں پہنچانا شروع کر دیتے ہیں۔ جن درویشوں نے ان مصائب کا سامنا کیا ان میں سے ایک منصور حلاج تھے جو ایک درویش شاعر تھے۔ جب انہوں نے 'اناالحق' کا نعرہ لگایا اور روایتی مذہب کو چیلنج کیا تو انہیں بغداد میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔

درویش روایتی مذہب کی راہ چھوڑ کر معرفت کی راہ اختیار کرتے ہیں اور آخر میں اپنا سچ تلاش کر لیتے ہیں۔ بدھا نے کہا ہے' ہر انسان کا اپنا تجربہ اس کا سب سے بڑا رہنما ہے'

REFERENCES

1. Parrinder Geoffery......Mysticism in the World Religions...Oneworld Oxford 1976
2. Lewis I M...Ecstatic Religion England 1971
3. Buddha...Dhamapada...Translaticn by Thomas Cleary, Bantam Books USA 1995
4. Gibran Khalil...Prophet...Jarco Publishing House USA 1957
5. Shah Idries...The way of the Sufi...........
Penguin Books England 1968
6. Sohail Khalid...From Islam to Secular Humanism Abbeyfield Publishers Canada 2001
7. Kumar Sehdev...The Vision of Kabir Alpha and Omega Books Canada 1984

انسانی نفس (سائکی)۔۔ روح یا ذہن؟

Human Psyche: Soul or Mind?

تخلیق: ڈاکٹر خالد سہیل، ترجمہ: ڈاکٹر بلند اقبال

انسانی تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب انسانی نفس (سائکی) پر صرف روح کا خیال غالب تھا۔ مذہبی لوگوں کا یقین تھا کہ روح انسانی بدن سے قطعی مختلف اور اُس کی پیدائش سے قبل پیدا ہونے والی کوئی شے ہے۔ اُن لوگوں کا ماننا تھا کہ روح ایک ایسا ہولہ ہے جو کسی بھی بچے کی پیدائش کے دوران کسی خاص مرحلے پر اُس کے نمو پاتے بدن میں خداوند کی طرف سے شامل کر دیا جاتا ہے اور پھر یہ روح اُس بدن میں اُس وقت تک بسیرا کرتی ہے جب تک موت اُس جسم کو ختم کرنے کا سبب نہ بن جائے۔ موت کے لمحہ یہ روح جسم سے پرواز کر کے عالم ارواح میں کہیں بس جاتی ہے اور پھر روزِ قیامت جسم کے بُرے یا اچھے اعمال کے نتیجے میں جنت یا دوزخ کے سپرد ہو جاتی ہے۔ یہ مخصوص مذہبی نظریہ طویل انسانی تاریخ میں یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں شامل تھا اور اب بھی معروف ہے۔

انسانی تاریخ میں دوسرا روحانی عقیدہ بھی موجود رہا ہے۔ اس عقیدے کے ماننے والے لوگوں کا یقین تھا کہ انسانی روح بدن سے مختلف ایک ایسی شے ہے جو انسان کے نیک یا بد اعمال کے لحاظ سے جنم در جنم اپنے جسم کا چوغہ بدلتی رہتی ہے حتیٰ کہ کسی آخری جنم میں پاک ہو کر نروانہ nirvana کا مقام حاصل کر لے۔ نروان وہ مقامِ اعلیٰ ہے جہاں اس آواگون کے بعد روح بالآخر اپنے پیدا کرنے والے خداوند یا بھگوان کی پاکیزہ روح میں شامل ہو کر مکتی حاصل کر لیتی ہے اور جنم در جنم کی سزا سے نکل جاتی ہے۔ یہ مخصوص نظریہ ہندوؤں اور بدھ مذہب پر ایمان لانے والے بھکشوؤں میں شامل ہوا اور اب بھی اُن کے ایمان کا حصہ ہے۔

ان مذہبی اور روحانی نظریات میں پنہاں انسانی زندگی کی دائمی موجودگی کی شدید ترین خواہش، امید اور خواب کے سوا کچھ نہیں۔ انسانی بدن جو ایک محدود دورانیہ کا حامل ہے ایک لامحدود روح کو خود میں شامل کر کے لامحدود خداوند کے تصور سے جڑ کر دائمی حیات کا طلب گار ہونا چاہتا ہے اور ایمان کے ان تصورات سے بندھا رہنا چاہتا ہے۔

جہاں ہزاروں سال پرانے اِن مخصوص مذہبی نظریات نے انسانی ذہن پر اپنے اثرات مرتب کیے وہی کچھ صدیوں قبل ایک نئی سائنسی فکر نے بھی انسانی ذہن کو متاثر کیا۔ اس فکر کا تعلق سائنسی سیکولر علم و آگہی سے تھا۔ اس فکر سے متعلق لوگوں کے خیال میں انسانی نفس (سائکی) انسانی ذہن ہی کا دوسرا نام ہے۔ ذہن یا انسانی نفس (سائکی) انسانی جسم کا ہی ایک حصہ ہے جو اُس کے بغیر اپنی کوئی شناخت یا وجود نہیں رکھتا۔ دماغی عوامل کے نتائج میں پیدا ہونے والی مخصوص سائکی یا ذہن انسانی شخصیت کے بننے سنورنے اور اُس کی فکر و آگہی کا سبب بنتی ہے اور انسانی جسم کو ایک شخصیت میں ڈھال دیتی ہے۔ اِس نفسیاتی سیکولر آگہی کی بنیاد ماہر حیاتیات چارلز ڈارون، بابائے علم نفسیات سگمنڈ فرائڈ، عالم معاشیات کارل مارکس اور وجودیت کے فلسفی ژاں پال سارتر جیسے عظیم مفکروں کی اعلیٰ ترین غور و فکر کا عملی نتیجہ ہے۔ اس نفسیاتی سیکولر آگہی کی وجہ سے سائیکی کو انسانی ذہن کا نام دیا جاتا ہے۔ اس نظریہ حیات کو ماننے والے لوگ حیات بعد الموت کی بجائے انسانی جسم اور اُس کے دماغ کے نفسیاتی تصور پر یقین رکھتے ہیں اور انسانی جسم کے خاتمے پر اُس کی سائکی کی موجودگی کو بے معنی جانتے ہوئے اس دنیا میں ہی بہتر سے بہتر زندگی کی موجودگی کو اہمیت دیتے ہیں۔ اُن لوگوں کی تمام تر کوششوں کا مرکز انسانوں کو ایک پُر معنی زندگی اور دنیا کو جنت کے خیال جیسی خوش شکل شے کا روپ دینا ہے۔

اس نفسیاتی سیکولر آگہی کے حصول کے لیے ایک حیاتیاتی، نفسیاتی اور معاشرتی ماڈل Bio-psycho-social بنایا گیا جس کی بنیادوں اور بننے سنورنے میں علم نفسیات، سوشالوجی اور نرسنگ جیسے سائنسی علوم نے بھرپور انداز میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس ماڈل کے لحاظ سے انسانی نفسیات کا مطالعہ بالآخر مختلف امراض کی دریافت اور اُن کے علاج کی شکل میں کامیابی کے ساتھ ظاہر ہوا۔ مثلاً شائزوفرینیا schizophrenia اور مینک ڈیپریسو النس Manic depressive illness کے مریضوں میں تین طرح کے عوامل اہم ہیں۔

1- حیاتیاتی عوامل Biological factors جن میں موروثی عوامل شامل ہیں جو بچوں کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔

2- نفسیاتی عوامل Psychological factors نفسیاتی طور پر غیر صحتمند خاندانوں میں پلنے والے بچوں کی نشوونما میں شامل تلخ تجربات اور نفسیاتی دھچکے مستقبل میں ابنارمل شخصیت کا سبب بنتے ہیں۔

3- سماجی عوامل social factors ہجرت کر کے نئی بستیوں میں آکر رہنے والے لوگ بھی کبھی کبھار نئی تہذیب میں صحت مندانہ انداز میں بسنے میں مشکلات کے سبب ذہنی دشواریوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور اکثر و بیشتر ذہنی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سیکولر نفسیاتی ماہرین ان عناصر کی حیاتیاتی، نفسیاتی اور معاشرتی وجوہات کو جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حیاتیاتی عوامل کا ادویہ سے' نفسیاتی عوامل کا انفرادی تھیرپی سے اور سماجی عوامل کا فیملی اور گروپ تھیرپی سے علاج کرتے ہیں۔ اس ماڈل کے تحت ہونے والے طریقہ علاج سے نفسیاتی امراض کا علاج انتہائی کامیاب نتائج کا سبب بنا ہے۔

میری مشاہدے میں یہ آیا ہے کہ بہت سے طبیب' ماہرینِ نفسیات اور تھیرپسٹ اپنی مذہبی' روحانی اور سیکولر فکر کو مریض کے علاج کے لیے اہم تصور نہیں کرتے اور عموماً مریض کی طرف سے ان موضوعات پر سوالات کا جواب دینا پسند نہیں فرماتے جبکہ میرا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ میرے مریض جب کبھی بھی میرے مذہبی، روحانی یا سیکولر فکر کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو میرا اظہار عموماً سیدھا اور سلیس لفظوں میں یوں ہوتا ہے کہ میں ایک سیکولر ہومنسٹ Secular Humanist ہوں جو تمام لوگوں کی مذہبی، روحانی اور سیکولر روایتوں کی نہ صرف دل سے عزت کرتا ہے بلکہ اُن کی ذات کی آگہی اور سچائی کو جاننے میں اُن کی مدد بھی کرتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ دنیا میں اُتنی ہی سچائیاں ہیں جتنے یہاں انسان بستے ہیں اور اُتنے ہی حقائق بھی ہیں جس قدر دنیا بھر کی آنکھیں اُنہیں دیکھتی ہیں۔ میرے بہت سے مریض مذہبی فکر کے حامل ہوتے ہیں مگر ہم میں باہمی عزت و احترام کا رشتہ ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے۔ میرا نقطہ نظر عموماً اُن پر جلد ہی واضح ہو جاتا ہے کہ میری اُن کی زندگی میں موجودگی اُن کے مذہبی

نظریات یا فلاسفی پر بحث و مباحثہ یا تبدیلی نہیں بلکہ نفسیاتی و معاشرتی علاج کے ذریعے اُن کی بہتر اور صحت مندانہ زندگی کے امکانات کا حصول ہے۔ جہاں کچھ غیر مذہبی یا دہریہ ماہرین نفسیات اپنے مریضوں کی چرچ میں عبادت کو غیر ضروری تصور کرتے ہیں وہاں میرا رجحان اُن کی مذہبی و روحانی مصروفیت کو ایک نفسیاتی سکون کا سبب جان کر اُس کے حق میں ہوتا ہے ماسوائے اُس صورت جب چرچ یا مذہبی مقامات پر پائے جانے والے اُن کے دوست و رشتہ دار جدید نفسیاتی طریقہ علاج کے لیے مسائل پیدا نہ کریں۔

مجھے یاد ہے ایک بار پاکستان میں مقیم میری آنٹی شائزوفرینیا کے مرض کا شکار ہو گئی تھیں۔ اُنہیں ماہر نفسیات کو دکھایا گیا تھا جس نے اُنہیں Modecate کے انجکشن اور سائیکوتھراپی کا مشورہ دیا تھا۔ میرے مذہبی انکل نے مجھ سے ایک روحانی عامل سے علاج کے حوالے سے بات کی تھی جن کے روحانی علم پر میری آنٹی اور انکل کو خاصا یقین تھا۔ میرا جواب اس سلسلے میں یہی تھا کہ وہ اُس روحانی عالم سے ضرور مشورہ لیں مگر Modecate کے انجکشن اور سائیکوتھراپی کسی صورت بھی ترک نہ کریں۔ ایک دلچسپ صورت اُس وقت سامنے آئی جب اچانک پاکستان میں Modecate کے انجکشن کا حصول ممکن نہ ہو سکا اور اُن کی نفسیاتی صحت گرتی چلی گئی یہ الگ بات کہ اس دوران وہ باقاعدگی سے اپنے روحانی عالم کے پاس علاج کراتی رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آگیا کہ میری آنٹی کی طبیعت کی خرابی سے سارا خاندان پریشان ہو گیا پھر بالآخر انکل کی درخواست پر میں نے کینیڈا سے Modecate کے انجکشن پاکستان بھجوائے جن کے استعمال کے بعد آنٹی کی طبیعت بہتر ہوتی چلی گئی۔ اس تجربے کے بعد میری آنٹی اور انکل میرے اس جملے پر یقین لے آئے کہ ماہر نفسیات سے علاج کسی کیک کی طرح ہے تو روحانی پریکٹس کیک پر موجود خوش ذائقہ کریم کی طرح۔

آج اگر ہم دنیا پر ایک عمومی نظر ڈالیں تو ہمیں تین گروہ۔۔۔ مذہبی، روحانی اور سیکولر افکار رکھنے والے۔۔۔ چاروں اطراف نظر آتے ہیں۔ مذہبی لوگ روح اور روزِ قیامت پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ روحانی لوگوں کا ایمان آواگون اور جنم در جنم سے روح کے تعلق پر ہے اور تیسرا گروہ اُن سیکولر لوگوں کا ہے جو روح کو ماننے کے بجائے اسے انسانی فکر، نفس (سائیکی) یا ذہن کا نام دیتے ہیں جو جسم یا بدن کی موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اُن کا ایمان کسی حیات بعد

الموت، روزِ قیامت، اواگون اور جنم در جنم جیسے تصورات پر نہیں ہے۔ ایک سیکولر ہیومنسٹ کے طور پر میرا تعلق اسی تیسرے گروہ سے ہے مگر مجھے بقیہ دو گروپ کے افراد کی نفسیاتی مدد میں کبھی بھی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی۔ ایک ماہرِ نفسیات اور طبیب کے طور پر میری ذمہ داری اُن کے نفسیاتی مسائل کا حل اور ایک صحت مند، پُرسکون اور پُر لطف زندگی کی دریافت ہے۔ میں ایک ماہرِ نفسیات ہوں نہ کہ مذہبی پیشوا جس کا تعلق انسانی ذہن کے علاج سے ہے نہ کہ روح کے خیالی تصور کی دیکھ بھال سے۔

'روحانی تجربات'... سائنس اور نفسیات کے آئینوں میں

خالد سہیل

بیسویں صدی میں سائنس اور نفسیات نے اتنی ترقی کی کہ بہت سے سائنسدانوں اور ماہرینِ نفسیات نے انسانوں کے ان تجربات کا مطالعہ اور تجزیہ کرنا شروع کیا جو 'روحانی تجربات' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ایسی تحقیق نے ہمیں بتایا ہے 'روحانی تجربے' صرف مذہبی لوگوں کو ہی نہیں ہوتے وہ کسی انسان کو بھی ہو سکتے ہیں۔ ماہر نفسیات ابراہم میسلو نے اپنے تجربوں کی بنیاد پر ہمیں بتایا کہ روحانیت انسانیت کا حصہ ہے اس کا خدا اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ میسلو کا خیال تھا کہ زندگی کی مذہبی اور غیر مذہبی خانوں میں تقسیم درست نہیں۔ وہ لکھتے ہیں 'روحانیت انسانیت کا حصہ ہے۔ اسے ہم سائنس اور نفسیات کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا روایتی مذہب سے کوئی تعلق نہیں' میسلو کا خیال تھا کہ ہر مرد اور عورت کو وہ تجربے ہو سکتے ہیں جو روحانی کہلاتے ہیں۔ اسی لئے اس نے ان تجربات کو نیا نام دیا اور وہ تجربے معراجی تجربے peak experiences کہلائے۔ جو کسی شاعر' ادیب' موسیقار' سائنسدان اور عام انسان کو ہو سکتے ہیں۔ ایسے تجربے کبھی شعر کہتے ہوئے' کبھی بچوں سے کھیلتے ہوئے اور کبھی غروبِ آفتاب کا منظر دیکھتے ہوئے وقوع پزیر ہو سکتے ہیں۔ میسلو نے اپنی کتاب میں ان معراجی تجربوں کی چالیس خصوصیات بتائی ہیں۔ میں یہاں صرف دو کا ذکر کروں گا۔(Ref1)

وہ لکھتے ہیں 'ایسے تجربے کے دوران انسان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ساری کائنات کے ساتھ مل گیا ہے۔ ذات اور کائنات کا فاصلہ ختم ہو جاتا ہے جیسے کوئی قطرہ سمندر میں مل جائے۔ اس تجربے میں حیرت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور انسان کو منکسر المزاجی کا احساس ہوتا ہے'۔

ایسے تجربے انسان کے کردار اور شخصیت کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ میسلو لکھتے ہیں 'ایسے

تجربوں سے انسان کے دل میں ہمدردی، اخوت اور محبت کے جذبات ابھرتے ہیں اور وہ ایک بہتر انسان بنتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت بھی محسوس کرتا ہے‘(Ref 1)

میسلو کا یہ بھی خیال ہے کہ ایسے معراجی تجربوں کو حاصل کرنے کے لئے انسانوں کو اپنے خاندانوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تجربے کہیں بھی وقوع پزیر ہو سکتے ہیں۔

یہ تصور کہ ساری کائنات مقدس ہے نیا تصور نہیں ہے۔ سرخ فام لوگوں Native Indians کی روایت میں یہ تصور بہت عرصے سے موجود ہے۔ جب ہم ان کا ادب پڑھتے ہیں تو اس میں لکھا پاتے ہیں کہ وہ سورج‘ چاند‘ زمین اور سمندر سب کو مقدس سمجھتے ہیں۔(Ref 2)

موہاک قبیلے کے پیٹر بلیو کلاوڈ۔Peter Blue Cloud۔ لکھتے ہیں‘ پہاڑوں اور زمینوں کا ہر ذرہ مقدس ہے‘۔ زونی Zuni کہتے ہیں‘ زمین کا ہر ٹکڑا گرجے کی طرح مقدس ہے‘

چیف سیٹل Chief Seattle کا بھی کہنا تھا کہ کائنات کا ہر ذرہ ہمارے لئے مقدس ہے۔ جب ہم روحانی تجربات کا سائنس اور نفسیات کے آئینے میں مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ان کا انسانی دماغ سے گہرا تعلق ہے۔ انسانی دماغ کے دو حصے ہیں۔ دایاں اور بایاں۔ بائیں حصے کا تعلق زبان سے ہے جبکہ دائیں حصے کا تعلق فنونِ لطیفہ اور روحانیت سے ہے۔ تخلیقی اور روحانی تجربے دائیں دماغ میں وقوع پذیر ہوتے ہیں اور پھر وہ بائیں دماغ تک پہنچتے ہیں اور پھر بایاں دماغ انہیں الفاظ میں ڈھالتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ جب دائیں دماغ کے تجربات بائیں دماغ تک پہنچتے ہیں تو اسے یوں لگتا ہے کہ وہ باہر سے آئے ہیں۔ وہ انہیں اپنانے سے انکار کر دیتا ہے۔ اگر وہ شخص ایک مذہبی معاشرے اور خاندان کا فرد ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ تجربات خدا اور فرشتوں سے آئے ہیں۔

ماہرینِ نفسیات نے جب دائیں دماغ کے مرگی epilepsy کے مریضوں کا مطالعہ کیا تو انہیں اندازہ ہوا کہ ایسے لوگوں کو بھی وہ تجربات ہوئے ہیں جو روحانی کہلاتے ہیں چاہے وہ مریض نظریاتی طور پر دہریہ تھے۔

اسی طرح جب محققین نے تحقیق میں حصہ لینے والے صحتمند volunteers افراد کو لیبارٹری میں رکھا اور ان کے دائیں دماغ کے ٹیمپورل لوبز temporal lobes کو تحریک دی

(stimulus) تو انہیں بھی وہ تجربے ہوئے جو صوفیانہ ادب میں روحانی تجربے کہلاتے ہیں۔

ایسی تحقیق نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ تجربے جو روایتی ادب میں روحانی کہلاتے ہیں ان کا تعلق انسانی دماغ کے دائیں حصے کے ٹیمپورل لوب Right temporal Lobe سے ہے۔

چونکہ بایاں دماغ انہیں قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اس لئے وہ غیب سے آتے محسوس کرتا ہے۔ غالب نے اسی لئے لکھا تھا

؎ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

آج کے سائنسدان اور ماہرینِ نفسیات کہہ سکتے ہیں کہ وہ تجربات جو روحانی کہلاتے ہیں ان کا تعلق خدا اور فرشتوں سے نہیں انسان کے اپنے لاشعور سے ہے۔

ڈاکٹر رابرٹ ہکمین نے اپنی کتاب CAN WE BE GOOD WITHOUT GOD(Ref3) میں بیسویں صدی کی سائنسی تحقیق کا تفصیلی تعارف اور روحانی تجربوں کا طبی اور نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔

اس تحقیق کی ابتدا مرگی کے مریضوں سے ہوئی کیونکہ ان مریضوں کا طبی علاج مقصود تھا۔ پہلا قدم یہ تھا کہ دماغ کے مختلف حصوں کو بجلی کے جھٹکے لگائے جائیں تاکہ پتہ چل سکے کہ دماغ کے کس حصے کا جسم کے کس حصے سے تعلق ہے۔ دماغ کے ایک حصے کو جھٹکا لگا تو بازو میں جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔ دوسرے حصے سے پاؤں تیسرے حصے سے چہرہ اور آنکھیں لیکن جب دماغ کے دائیں حصے کے ٹیمپورل لوب کو جھٹکا لگا تو مریض کے جسم کے کسی حصے کو جھٹکا نہ لگا بلکہ اس نے ایسے احساسات کا ذکر کیا جن کا ذکر صوفیا اور درویشوں کے روحانی تجربوں میں آیا ہے۔ اس تجربے سے محققین کو اندازہ ہوا کہ روحانی تجربات کا دائیں ٹیمپورل لوب سے تعلق ہے۔

Dr Hughlings Jackson نے اپنی تحقیق میں لکھا کہ بعض طرح کی مرگی کے مریضوں کو ایسے تجربے ہوتے ہیں جو روحانی تجربے کہلاتے ہیں۔ اور ان تجربوں کے لئے مریض کا مذہبی ہونا کوئی شرط نہیں۔

Dr. Wilder Penfield جو ایک کینیڈین سرجن ہیں نے لکھا‘ جب دائیں ٹیمپورل

لوب کو بجلی کے جھٹکے لگتے ہیں تو اس شخص کو داخلی سکون اور کسی اور ذات کے وجود کا احساس ہوتا ہے'
MA Persinger نے وہ تجربے صحتمند انسانوں پر بھی کئے اور جب ان کے دائیں ٹمپورل لوب کو جھٹکے لگائے تو انہوں نے بھی روحانی تجربوں کا اور خدا سے ہمکلام ہونے کا ذکر کیا۔ بعض کو خدا اور فرشتوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔

رابرٹ بکمین کا کہنا ہے کہ جولین جینز نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب۔ The Origin of Consciousness In the Breakdown of the Bicameral Mind (Ref 4)۔۔۔ میں دائیں اور بائیں دماغ کے رشتے کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے، جولین جینز کا کہنا ہے کہ انسانی تاریخ کا ایک وہ دور تھا جب انسانوں کو یوں لگتا تھا کہ ان کے خیالات ان کے اپنے نہیں ہیں بلکہ انہیں خدا اور فرشتوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور وہ ان آوازوں اور خیالات کو اپنے ہی خیالات سمجھتے تھے۔ آہستہ آہستہ انسانی ذہن کا ارتقا ہوا۔ اب سب انسانوں کو یہ احساس نہیں ہوتا لیکن شاعروں' ادیبوں' تخلیقی اور روحانی لوگوں کو ایسے تجربات ہوتے ہیں کیونکہ ان کے دائیں ٹمپورل لوب عام لوگوں سے زیادہ حساس ہوتے ہیں جن لوگوں کے ٹمپورل لوب حد سے زیادہ حساس ہیں انہیں مرگی کے دورے پڑتے ہیں جن کے ٹمپورل لوب تھوڑے سے حساس ہیں وہ شاعر اور درویش بنتے ہیں اور عام لوگوں کو بھی ایسے تجربات ہو سکتے ہیں اگر ان کے دائیں ٹمپورل لوب کو لیبارٹری میں بجلی کے جھٹکے لگائے جائیں۔

رابرٹ بکمین لکھتے ہیں 'انسان کے ذہن اور دماغ کی تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر دائیں ٹمپورل لوب کو بجلی کا جھٹکا لگایا جائے تو اسے خدا کی موجودگی کا احساس ہو سکتا ہے اور وہ فرشتوں سے ہمکلام ہو سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کا تصور اور تجربہ انسان کے اپنے ذہن کی اختراع ہے' (Ref 3)

اس مضمون کے آخر میں میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ایک نفسیاتی معالج اور انسان دوست دہریہ ہونے کے ناطے میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ تجربات جو روایتی ادب میں 'روحانی تجربات' کہلاتے آئے ہیں ان کا تعلق انسانی لاشعور سے ہے۔ ایسے تجربات کسی انسان کو بھی ہو سکتے ہیں اور ان کے لئے کسی خدا یا مذہب پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ وہ ہماری انسانیت

اور شخصیت کا حصہ ہیں کیونکہ ہر انسان کے دماغ میں دایاں ٹمپورل لوب موجود ہے اور ہر انسان کی شخصیت کا ایک پہلو درویشانہ ہے۔

REFERENCES

1. Maslow Abraham...Religions, Values, Peak experiences
Penguin Books England 1970
2. Cassidy James Editor...Through Indian Eyes
The Untold Story of Native Peoples
Readers Didest Association Canada 1996
3. Buckman Robert...CAN WE BE GOOD WITHOUT GOD
Prometheus Books Toronto Canada 2002
4. Jaynes Julian...The Origin of Consciousness in
the Breakdown of the Bicameral MInd...Marimer Books
New York USA 2000

جدید انسان کا روحانی مسئلہ

تحریر: کارل ینگ، ترجمہ: ڈاکٹر خالد سہیل

جب ہم جدید انسان کے روحانی مسئلے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم اس موضوع کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھ سکتے، کیونکہ ہم خود اس عہد کا حصہ ہیں، جس کے بارے میں ہم اظہارِ خیال کرنا چاہتے ہیں۔

انسانی تاریخ میں جدید انسان کو پیدا ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور چونکہ اس کے مسئلے کا حل اس کے مستقبل میں پوشیدہ ہے، اس لئے ہم اس مسئلے کے بارے میں معروضی انداز میں تبادلہِ خیال نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ چونکہ اس مسئلے کا تعلق پوری انسانیت سے ہے اور اس کے بے شمار پہلو ہیں، اس لئے ایک انسان کے لئے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس راستے پر بہت محتاط انداز سے چلنا ہوگا، کیونکہ ہم سے پہلے بعض لوگوں نے جب اس موضوع پر قلم اُٹھایا تو انہوں نے اپنے الفاظ سے زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیے، جس کی وجہ سے ہمیں اس مسئلے کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملی۔

اس موضوع کے حوالے سے میرا پہلا مشاہدہ یہ ہے کہ وہ انسان جسے ہم جدید کہتے ہیں، وہ عام انسان سے بہت مختلف ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے انسان کی ہے جو ایک ایسی پہاڑی پر کھڑا ہو جہاں اس کے آگے انسانیت کا مستقبل اور اس کے نیچے انسانیت کا ماضی دھند میں لپٹا ہوا ہو۔ جدید انسان کو جو چیز عام انسان سے ممیّز کرتی ہے وہ اس کی اپنے حال (Present) سے مکمل واقفیت ہے۔ جدید انسان کے شعور میں اتنی گہرائی اور وسعت پیدا ہو چکی ہے کہ وہ انسانی ارتقاء کی آخری سیڑھی پر کھڑا نظر آتا ہے۔ کسی انسان کے جدید ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ حال کی واقفیت کے ساتھ ساتھ اس کے مسائل کا شعور بھی رکھتا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس

دور کا ہر انسان اپنے آپ کو جدید کہلائے۔

جدید انسان کا مسئلہ یہ ہے کہ جوں جوں وہ لاشعور کو پیچھے چھوڑ کر شعور کو گلے لگاتا ہے وہ اپنے گروہ اور اپنی برادری سے کٹتا چلا جاتا ہے اور تنہائی اُسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ شعور کے حصول کے اس سفر میں وہ اپنے حیوانی اور قبائلی لاشعور کو پیچھے چھوڑ آتا ہے۔ اس کا ہر قدم اسے ماضی کے اجتماعی لاشعور کی کوکھ سے، جس میں عام انسان اپنی ساری زندگیاں گزار دیتے ہیں، جدا کرتا ہے۔ مہذب قوموں میں آج بھی عوام کی اکثریت نفسیاتی حوالے سے ماضی کے پتھر دھات کے زمانے میں زندگی گزارتی ہے اور شعور کی نسبت لاشعور کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ ہر قوم میں وہ لوگ اقلیت میں ہوتے ہیں جن کا شعور بیدار ہوا اور وہ عوام کی روایتی سوچ سے آگے نکل گئے ہوں۔ صرف جدید انسان ہی وہ لوگ ہیں جو پوری طرح حال میں زندہ رہتے ہیں۔ وہ اپنے اجتماعی ماضی سے متاثر نہیں ہوتے۔ انہیں اپنے ماضی میں صرف تاریخی حوالے سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ایسے انسان اپنی تاریخی روایات کو بہت پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ کائنات کے آخری کنارے پر کھڑے ہوں اور ان کے آگے بیک وقت کچھ بھی نہ ہو اور سب کچھ ہو۔

اگرچہ میرا یہ موقف بظاہر بہت سنگین لگتا ہے لیکن اس کا تعلق انسانی شعور کے ارتقا سے ہے۔ ہمارے عہد میں بہت سے بے شعور لوگ ایسے ہیں جنہیں جدید ہونے کا دعویٰ ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو جدید انسان کہلانا پسند کرے اور انکساری سے کام نہ لے، ہمیں اسے شک کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ یہ روایت کوئی نئی نہیں ہے۔ بلکہ سقراط اور مسیح کے دور سے چلی آرہی ہے۔

ہمارے دور میں کسی انسان کا جدید ہونا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، اس کے لیے نجانے کتنی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اعلیٰ درجے کا شعور، انسان کو ایک خاص قسم کے احساسِ گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس لئے صرف وہی شخص اس شعور کا بار اٹھا سکتا ہے، جو ماضی کے بھاری بوجھ کو پیچھے چھوڑ آیا ہو۔ انسانی شعور کی اگلی منزل کو صرف وہی شخص گلے لگا سکتا ہے جو پچھلی تمام منازل کو عبور کر آیا ہو۔

اس دور میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو جدید ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن میری نگاہ میں وہ جدید ہونے کا ڈھونگ رچا رہے ہیں۔ وہ انسان جو حقیقی معنوں میں جدید ہو وہ اس کا

دعویٰ نہیں کرتا بلکہ عجز و انکسار سے اپنے آپ کو روایتی کہتا ہے، اُس کا یہ رویہ بعض دفعہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ لوگ اُسے دیگر دعویداروں کی طرح خود فریبی کا شکار سمجھیں۔ اپنے حال سے پوری طرح آگاہ ہونا اور اس کو شعور رکھنا ایک تکلیف دہ عمل ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں خود فریبی میں مبتلا ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اس راستے میں بعض دفعہ بہت سے خوابوں کے شیش محل چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ مسیحی دُنیا میں جن لوگوں نے اپنے تصور میں دو ہزار سال سے مسیح موعود کا انتظار کیا تھا، حقیقی دُنیا میں بالآخر انہیں دوسری جنگ عظیم کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے جنت کے ارمانوں نے جہنم کا روپ اختیار کر لیا۔ ان حالات کو دیکھ کر ہمیں غرور اور تکبر کی بجائے عجز و انکساری اختیار کرنی چاہیے۔

اگرچہ یہ بات درست ہے کہ آج کا جدید انسان ہزاروں سالوں کے ارتقا کا نقطۂ عروج ہے لیکن کل کا انسان اس سے بھی آگے نکل جائے گا۔ آج کا جدید انسان جہاں انسانیت کے لئے باعثِ فخر ہے، وہیں وہ باعثِ ندامت بھی ہے اور وہ اس کا پورا شعور رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جہاں انسان نے سائنس اور ٹکنالوجی میں کمال حاصل کر لیا، وہیں وہ اس علم اور تجربے کو انسانوں کی فلاح و بہبود کی بجائے تباہی کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ آج کے دور میں نجانے کتنی حکومتیں ایسی ہیں جو ''امن کے دور میں جنگ کی تیاری'' کے اصول پر عمل کرتی رہتی ہیں۔ یورپ اور عیسائی دُنیا کی حقیقتوں نے عالمی برادری، جمہوریت اور معاشرتی عدل و انصاف کے خوابوں کو پاش پاش کر دیا ہے۔

ابھی ہم پہلی جنگِ عظیم کے اثرات سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے کہ ہمیں ایک اور تاریک طوفان کے بادل ابھی سے نظر آ رہے ہیں۔ (یہ مضمون 1928ء میں لکھا گیا تھا۔) اگرچہ بہت سے اصحابِ اختیار نے جنگ کے خاتمے کا اعلان کیا ہے لیکن عوام کو ان حاکموں کی نیت پر شک ہے۔ اس عہد کے جدید انسان نے بہت سے نفسیاتی دھچکے برداشت کیے ہیں، جن کی وجہ سے وہ شکوک و شبہات کی گہری کھائیوں میں زندہ ہے۔

میری اب تک کی گفتگو میں آپ کو میرے پیشے کی جھلک نظر آ گئی ہوگی۔ ایک طبیب کے لئے بیماریوں اور مسائل پر توجہ مرکوز نہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن یہ بھی اچھے طبیب کی نشانی ہے کہ جہاں بیماری نہ ہو وہاں وہ صحت کا اعلان کرے۔ اس لئے میں یہ تشخیص نہیں کرنا چاہتا ہے

مغرب کا سفید فام انسان بیمار ہے یا وہ اپنا جسمانی اور ذہنی توازن کھونے والا ہے۔

جب کوئی شخص، انسانی یا ثقافتی مسائل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو اس کا اپنا نقطۂ نظر بھی واضح ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ انسان کے اپنے مسائل، اسے کسی موضوع پر معروضی انداز میں اظہارِ خیال کرنے میں مانع ہوتے ہیں، اس لئے ہمیں کسی کی رائے کو قبول کرنے سے پہلے محتاط انداز اختیار کرنا چاہیے۔ میرا جدید انسان کے مسائل کے بارے میں موقف نہ صرف میرے اپنے تجربات پر بلکہ ان سینکڑوں تعلیم یافتہ لوگوں کے تجربات پر بھی مبنی ہے جنہوں نے صحت اور بیماری کی حالت میں مجھے اپنی ذات کے پنہاں خانوں میں جھانکنے کا موقع دیا۔ اس طرح میں نے ان کی داخلی اور خارجی زندگیوں کو قریب سے دیکھا اور ان سے نتائج اخذ کئے۔ انسان کی ذہنی اور جذباتی ضروریات بہت پرانی ہیں لیکن ماضی قریب میں انسانوں نے ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے اور اپنے مشاہدات اور تجربات کو علمِ نفسیات کا نام دیا ہے۔ اس علم کے ارتقاء میں طبّ کے ماہرین نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مذہب کے ماہرین انسانی نفسیات کو صرف ایمان اور روحانی اقدار کے دائرے کے اندر ہی دیکھ سکتے تھے۔ جب تک انسان جانوروں کی طرح اجتماعی اور قبائلی زندگی گزارتا تھا، اُس کی نفسیات گروہی نفسیات تھی۔ لیکن جوں جوں اس کی انفرادی زندگی اہم ہوتی گئی اور اس کی انفرادی شناخت کا اظہار ہونے لگا تو نفسیات کے علم کی عمارت ایمان کی بجائے، فلسفے اور انسانی تجربے پر استوار ہونے لگی۔ یہ قدم اجتماعی نفسیات کے لئے ایک نیا سانحہ تھا۔ جوں جوں انسان نے انفرادی سطح پر آزادانہ اور خود مختارانہ زندگی گزارنی چاہی تو نہ صرف اس کا اپنے قبیلے کے ساتھ تضاد ابھرا بلکہ وہ داخلی تضاد کا بھی شکار ہو گیا۔ فرائڈ نے انسان کے ان ہی نفسیاتی تضادات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اُس نے واضح کیا کہ بظاہر مہذب انسان درپردہ بہت سے باغیانہ اور پاگل پن کے رجحانات سے نبرد آزما ہوتا رہتا ہے۔

انسان کی لاشعوری زندگی کوئی نئی حقیقت نہیں ہے۔ لیکن انسانی تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ ہم نے اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ ہم نے انسان کی لاشعوری زندگی کو سائنسی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نفسیات کے علم کو سائنس کا حصہ بنایا ہے۔ ماضی کے انسان اپنی زندگی کی کئی جہتوں کو نظر انداز کرتے آئے ہیں ہم نے اب ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا

شروع کردیا ہے۔

انسانی زندگی کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان میں جنگ عظیم نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس جنگ نے ہماری خوداعتمادی اور انسان دوستی پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ جنگ سے پہلے ہم انسانی مسائل کی ذمہ داری اغیار کے کندھوں پر ڈالا کرتے تھے۔ اب ہمیں احساس ہوا ہے کہ ہم اور ہمارے دشمن ایک کشتی میں سوار ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا جب ہم جنت کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ اب ہم جہنم کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارے بچپن کے خوابوں کو جوانی کے حقائق نے پاش پاش کر دیا ہے۔

جدید انسان نے انسانی سلامتی، تحفظ اور فلاح و بہبود کے آدرشوں کو مسمار ہوتے دیکھا ہے۔ اُسے احساس ہونے لگا ہے کہ اس کی مادی ''ترقی'' اس کے لئے تباہی کا سامان تیار کر رہی ہے اور وہ ''امن کے وقت میں جنگ کی تیاری'' کے فارمولے پر عمل کرنے لگا ہے جو افسوس ناک صورتِ حال ہے۔ سائنس نے خودفریبی کے دامن کو تار تار کر دیا ہے اور انسان کو بدصورت حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔

انسانوں کے لئے اس بات کا شعور پریشان کن ہے کہ ان کے لاشعور میں اس قدر ظلم، ناانصافی اور بدی چھپے ہوئے ہیں کہ اکثر انسان اس خودفریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ اس بدی کو دبائے اور چھپائے رکھ سکتے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگوں نے اپنی ذات کے تاریک رُخ کو سمجھنے کے لئے نفسیات کا سہارا لیا ہے۔ آج کا انسان خارجی زندگی سے مایوس ہو کر داخلی زندگی میں دلچسپی لینے لگا ہے، اس لئے اس کا نفسیات کا مطالعہ بڑھ گیا ہے۔ جدید انسان کو جن سوالوں کے جواب مذہب نے نہیں دیے، اب وہ انہیں نفسیات میں تلاش کر رہا ہے۔ اسے احساس ہو رہا ہے کہ مذہب کے جوابات انسان کی ذات کی گہرائیوں سے ابھرنے کی بجائے آسمان کی بلندیوں سے اترتے ہیں، جن سے اب وہ مطمئن نہیں ہے۔

جدید انسان کی دلچسپی صرف نفسیات کی سائنسی یا تحلیلِ نفسی تک ہی محدود نہیں، بلکہ اس میں روحانیات، فلکیات، یوگا اور اس قسم کی کئی اور چیزیں بھی شامل ہیں۔ بعض نے تو ان علوم کو ''روحانی سائنس'' اور ''مسیحی سائنس'' کا نام بھی دے دیا ہے۔ یہ تحریکیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ عوام سیاست کی طرح مذہب سے بھی بددل ہو گئے ہیں اور اب انسانوں کو سمجھنے

کے لئے نئے راستے تلاش کر رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ انیسویں صدی کے مقابلے میں بیسویں صدی کا انسان مذہب کی بجائے سائنس اور ایمان کی بجائے علم کی طرف زیادہ مائل نظر آتا ہے۔ جدید انسان ان نظریات اور اعتقادات کو ماننے کے لئے تیار نہیں جن کی بنیاد انسانی علم اور تجربے پر نہ ہو۔

آج کا انسان لاشعور کی حقیقتوں کو جاننا چاہتا ہے۔ وہ توہمات کا پردہ چاک کرنا چاہتا ہے۔ وہ علم اور تجربے کی نئی شمعیں جلاتا اور انسانی زندگی کے تاریک گوشوں کو روشن کرنا چاہتا ہے۔ مغربی انسان کی نفسیات میں دلچسپی انقلابِ فرانس کے بعد آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مغرب کا مشرقی اوپنشدوں اور مشرقی ذہن کی بھول بھلیوں سے تعارف ہوا تھا۔ میری نگاہ میں قوموں کی نفسیات بھی انفرادی نفسیات کی طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ یہ علیحدہ بات کہ وہ تبدیلی کافی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ جب کسی قوم کی اجتماعی نفسیات کو تاریکی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ روشنی کی تلاش میں نکلتی ہے۔ مغربی نفسیات مشرقی علم سے جس قدر متاثر ہوئی ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ مغرب کی اجتماعی نفسیات آہستہ آہستہ اس مقام پر آ پہنچی ہے کہ وہ شوپنہار اور نیٹشے کے پیغاموں کو قبول کرنے کے تیار ہو گئی ہے۔

کسی بھی قوم کی عظیم ایجادات آسمان سے نہیں اترتیں بلکہ زمین سے ابھرتی ہیں۔ وہ اوپر سے نیچے نہیں آتیں، بلکہ درختوں کی طرح نیچے سے اوپر کی طرف اُٹھتی ہیں۔ آج کے انسان کو اتنے مسائل کا سامنا ہے کہ اس کا ایمان شک میں بدل گیا ہے۔ وہ بظاہر تو اپنے اردگرد امن کے سپاس نامے، جمہوریت، ڈکٹیٹر شپ، سوشلزم اور سرمایہ داری سے انسانی مسائل کو حل کرنے کے دعوے دیکھتا ہے لیکن اپنے من میں ان پر اعتماد کھو بیٹھا ہے۔ آہستہ آہستہ دُنیا اتنی بھیانک ہو گئی ہے کہ انسان کے لئے اُسے چاہنا تو کیا اپنی ذات کو پسند کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ انسان اپنی داخلی اور خارجی زندگی سے پریشان ہو گیا ہے۔ بعض مذہبی عقائد زندگی کے عارضی پن، کرما اور حیات بعد الموت کی کہانی سناتے ہیں اور اگلی دُنیا میں ایک بہتر زندگی کا وعدہ کرتے ہیں لیکن جدید انسان ان طفل تسلیوں سے بہت آگے نکل آیا ہے۔

جدید انسان کا یہ مسئلہ صرف مذہبی عقائد اور اُخروی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی زد میں مادی اور دُنیاوی زندگی بھی آ گئی ہے۔ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت نے ثابت کیا کہ

سائنس کی بنیادیں اتنی ٹھوس نہیں تھیں، جتنی کہ ہم صدیوں سے سمجھتے آئے ہیں۔ شاید اسی لیے جدید انسان اپنی داخلی زندگی سے وہ خلا پورا کرنا چاہتا ہے جو اسے خارجی دُنیا میں نظر آتا ہے وہ خارجی دُنیا کے شک کو داخلی دُنیا کے ایمان اور یقین سے بدلنا چاہتا ہے۔

مغربی انسان کی روحانی صحت ناگفتہ بہ ہے۔ اس کے چاروں طرف خود فریبی کا دھواں پھیلا ہوا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ اس حقیقت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے کہ باقی دُنیا کے لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟ کیا وہ چین اور ہندوستان کے لوگوں کے خیالات سے واقف ہے؟ کیا وہ سیاہ فام لوگوں کے جذبات سے آشنا ہے؟ کیا وہ جانتا ہے کہ اس نے کتنی قوموں کا استحصال کیا ہے؟ اُن کی زمینیں لے کر انہیں بیماریاں دی ہیں۔

میں ایک امریکی انڈین قبیلے کے سردار کو جانتا ہوں۔ ایک دفعہ جب ہم سفید فام لوگوں کے بارے میں بے تکلفانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے تو اس نے کہا تھا۔ ''ہم سفید فام لوگوں کو اب تک سمجھ نہیں پائے۔ وہ ہمیشہ محتاط نظر آتے ہیں اور اپنی ضرورتوں کا رونا روتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ بے چین نظر آتے ہیں۔ اُن کے ناک تیکھے ہیں، ہونٹ پتلے ہیں اور ان کے چہروں پر پریشانی کی لکیریں نظر آتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ سب دیوانے ہو گئے ہیں۔''

میرے امریکی انڈین دوست نے نام لیے بغیر سفید فام لوگوں کے اس غرور کو پہچان لیا تھا جس کی وجہ سے وہ عیسائیت کو دُنیا کا واحد سچا مذہب اور عیسیٰ کو واحد مسیحا سمجھتے ہیں۔

میری نگاہ میں مغرب ایک عجب تضاد کا شکار ہے۔ پہلے اس نے مشرق کے امن کو اپنی سائنس اور ٹکنالوجی سے درہم برہم کیا اور پھر سکون کی تلاش میں اپنے پادریوں کو چین بھیجا۔ افریقہ میں عیسائیت نے جو کردار ادا کیا ہے وہ عبرتناک ہے۔ پہلے عیسائیوں نے افریقہ میں تعدد ازواج (Polygamy) پر پابندیاں لگا کر طوائفوں کی تعداد میں اضافہ کیا اور پھر ان کی جنسی بیماریوں کے علاج پر ہزاروں پونڈ خرچ کیے۔ پولی نیشیا (Polynesia) میں افیون کا کاروبار ایک اور ہی کہانی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ مغرب کے عیسائی اپنی ان کارروائیوں پر نادم ہونے کی بجائے فخر کرتے ہیں۔ ان حقائق کو جاننے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مغرب کا انسان خود فریبی کی دھند میں کیونکر گھر گیا ہے۔ اس میں حقائق قبول کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ اس نے اپنی زندگی اور شعور کی ساری غلاظت کو لاشعور میں دھکیل دیا ہے۔

لاشعور کی اس غلاظت کو پرکھنے کے لئے ہمیں فرائڈ جیسے عظیم انسان کی ضرورت تھی۔ فرائڈ جب ان غلاظتوں کا ذکر کرتا ہے تو چاروں طرف بدبو پھیل جاتی ہے۔ لیکن وہ بدبو اور تعفن ہم سب کے اندر ہے۔ بدقسمتی سے ہم سب اُسے چھپاتے پھرتے ہیں اور اس پر جہالت اور خود فریبی کے پردے ڈالتے رہتے ہیں۔ میری نگاہ میں اپنی ذات کی گہرائیوں سے واقفیت اور اپنی خوبیوں اور خامیوں کا شعور چاہیے وہ کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو ہماری نجات کی طرف پہلا قدم ہے۔ ہمیں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ جب ہم لاشعور کی گہرائیوں میں اترتے ہیں تو پہلے ہماری ملاقات گندگی اور غلاظت سے ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم وہ سفر جاری رکھیں تو پھر ہمارا اپنی ذات کے صحتمند، توانا اور پاکیزہ مناظر سے بھی تعارف ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ بات کہ بہت سے لوگوں میں اس جانکسل طویل سفر کی ہمت نہیں ہوتی اور وہ آدھے راستے میں ہی تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

ہمیں آہستہ آہستہ احساس ہو رہا ہے کہ مغرب میں جن چیزوں کو جدید سمجھا جاتا ہے وہ مشرق میں قدیم سمجھی جاتی ہے۔ یورپ میں جنس جیسے موضوعات جو نئے سمجھے جاتے ہیں وہ ہندوستان اور چین میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال پرانے ہیں۔ بعض ماہرین نے تو تحلیل نفسی اور یوگا میں بھی مقابلہ کیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغربی انسان کو اس بات کا احساس ہے کہ اگر مغرب نے مشرق کی مادی زندگی کو تہ و بالا کیا ہے تو مشرق نے بھی مغرب کی روحانی زندگی کو چیلنج کیا ہے۔ اگر مغرب مشرق کے خارج میں طوفان لا رہا ہے تو مشرق مذہب کے داخل میں انقلاب برپا کر رہا ہے۔

مشرقی علوم نے مغرب کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ مغرب کے بعض اہالیان مذہب یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہمالیہ کے غاروں یا تبت میں چند ایسے مہاتما موجود ہیں جو ساری دُنیا کے انسانوں کی ذہنی اور روحانی زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یورپ کے بعض پڑھے لکھے لوگوں نے مجھ سے بھی کہا ہے کہ میرے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ کسی مہاتما کا مرہونِ منت ہے۔ میری نگاہ میں یہ خیال کسی دیوانے کی بڑ نہیں بلکہ اساطیری کہانیوں کی طرح اپنے اندر کچھ سچائی بھی لئے ہوئے ہے۔ میری نگاہ میں مشرقی دانش صرف تبت اور ہمالہ تک ہی محدود نہیں بلکہ ہم میں سے ہر انسان کے قلب اور روح کی گہرائیوں میں بسی ہوئی ہے۔ افسوس کہ بات ہے کہ

رشتہ اپنی ذات کے نہاں خانوں سے کٹ چکا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اب ہم ان نئی بصیرتوں کے لئے تیار ہو رہے ہیں جو ہمارے اندر چھپی ہوئی ہیں۔ میں اپنے آپ کو کوئی پیغمبر نہیں سمجھتا لیکن میں اس بے اطمینانی کے بعد سکون کے دور کی اور عدم تحفظ کے بعد سلامتی کے دور کی پیشن گوئی کرتا ہوں اور میری یہ بشارت انسانوں کے بدلتے ہوئے حالات اور کیفیات پہ مبنی ہے نہ کہ میری طفلانہ خواہشوں پر۔

میری نگاہ میں مغربی انسان کا اپنی ذات، اپنے ذہن اور اپنی نفسیات میں گہری دلچسپی لینا ایک خوش آئند بات ہے اور یہ دلچسپی اتنی جدید ہے کہ ناپسندیدہ حقائق کو جاننے کے باوجود ختم نہیں ہوتی۔ جدید انسان نے ماضی اور روایت کی شاہراہوں کو چھوڑ کر پگڈنڈیوں پر چلنا شروع کر دیا ہے۔ اس نے بدھا کی طرح ہزاروں بتوں کی خدائی کے فرمودات کے مقابلے میں اپنے ذاتی تجربے کو زیادہ اہمیت دینی شروع کر دی ہے۔

میری اس گفتگو کے آخر میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ میں نے جدید انسان کے جس روحانی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے، کیا وہ حقیقی ہے یا محض سراب؟ عین ممکن ہے کہ مغرب کے بہت سے ماہرین یہ کہیں کہ یہ مسئلہ میری اپنی ذہنی اختراع ہے اور اس کا ان کی ذاتی اور معاشرتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ المیہ یہ ہے کہ آج مغرب کا خدا اور مشرق کا اللہ اپنے آپ کو ایک دوسرے سے بہتر سمجھتے ہیں۔

یورپ کے بہت سے دانشور سمجھتے ہیں کہ مذہب سادہ لوح انسانوں اور عورتوں کو خوش رکھنے کے لئے تو اچھی چیز ہے لیکن حقیقی زندگی میں معاشی اور سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔

مجھے بعض دفعہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اس انسان کی طرح ہوں جو لوگوں کو ایسے حالات میں بارش اور طوفان کی بشارت دیتا ہے جب لوگوں کو آسمان پر ایک بادل بھی نظر نہیں آ رہا ہوتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ طوفان افق کے نیچے ہو اور کسی کو نظر نہ آ رہا ہو۔ جب ہم جدید انسان کے روحانی مسئلے کا ذکر کرتے ہیں تو ہم اس طوفان کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں جو شعور کی سطح سے بہت نیچے ہوتا ہے اور ایسے پھولوں کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں جو صرف رات کو کھلتے ہیں۔

بعض لوگ رات کو ایسے ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں کہ ان کی دن کی زندگی غارت ہو جاتی

ہے اور بعض لوگوں کی دن کی زندگی ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ہوتی ہے اور وہ رات کا انتظار کرتے ہیں، جب ان کا جسم سوتا ہے اور روح بیدار ہوتی ہے۔ چونکہ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ جدید انسان کا روحانی مسئلہ، میرا وہم نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔

مجھے اس گفتگو کے آخر میں اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ میری گفتگو کا مرکز انسان کے ذاتی اور نفسیاتی مسائل رہے ہیں۔ میں اجتماعی اور سیاسی مسائل کو اپنا موضوع نہیں بنایا، جنہیں بین الاقوامی تحریکوں اور لیگ آف نیشنز نے اپنی توجہ کا مرکز بنا رکھا ہے۔

روایتی سوچ کے لوگوں نے مادہ اور توانائی اور جسم اور ذہن کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ میری نگاہ میں وہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ جسم اور ذہن، مادہ اور روح اور شعور اور لاشعور کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ موت نئی زندگی کو جنم دیتی ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا سوئی ہوئی قوم ایک دفعہ پھر انگڑائی لے کر بیدار ہوں گی یا نہیں؟ اور کیا انسان اپنے داخلی اور خارجی تضادات سے بالاتر ہو کر ایک نئے شعور کو گلے لگائے گا یا نہیں۔

ان سوالوں کا جواب ہماری بجائے تاریخ کے پاس ہے اور اسے جاننے کے لئے ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔

ایمان: شخصیت ایک رُخ

تحریر: اریک فرام، ترجمہ: ڈاکٹر خالد سہیل

موجودہ دور میں جہاں عقل کا بہت چرچا ہے، ایمان کا تصور زیادہ مقبول نہیں ہے۔ آج کل جب کوئی شخص ایمان کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے ذہن میں سائنس اور منطق کے مقابلے میں خدا اور آسمانی کتابوں کے خیالات زیادہ اُبھرتے ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ حقائق کا رشتہ سائنس سے ہے جبکہ ایمان مابعد الطبیعات اور روحانیات سے متعلق ہے۔ اگر یہ مفروضات ٹھیک ہیں تو اس کے بعض بہت خطرناک نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ اگر ایمان عقل اور سائنس کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا تو ہمیں اسے ماضی کے فرسودہ نظام کی باقیات سمجھ کر نظر انداز کرنا پڑے گا۔

ایمان کے بارے میں ہمارے سوچنے کے انداز میں دھیرے دھیرے بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہم نے گرجے کی بہت سی پابندیوں سے چھٹکارا حاصل کیا ہے۔ عقل کی ترقی کے ساتھ ساتھ آزادانہ سوچ نے بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ جہاں ہم نے اس ترقی سے استفادہ کیا ہے وہیں ہم نے اس کی قیمت بھی ادا کی ہے۔

جب ہم موجودہ دور میں انسان کی ذات اور معاشرے کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ایمان سے دوری نے اتنے مثبت نتائج مرتب نہیں کئے جتنے اس نے چند سو سال پہلے کئے تھے۔ چند صدیاں پیشتر جب عقل نے ایمان کے خلاف بغاوت کی تھی تو وہ مذہبی زنجیروں اور توہم پرستی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی اور انصاف، آزادی اور انسانوں میں برادرانہ تعلقات استوار کرنے کی کوشاں تھی۔ لیکن آج کے دور میں ایمان سے دوری ذہنی افراتفری اور کرب کی عکاسی کرتی ہے ___ ایک دور میں مدلل انداز فکر سوچ کے ارتقا میں مد

ثابت ہوتا تھا۔ لیکن آج وہ اپنی کمزوریوں اور بے یقینی کو چھپانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

کسی شخص یا گروہ کا یہ فرض کر لینا کہ ہمیں کائنات کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لینے سے ازلی و ابدی سچائیاں مل جائیں گی۔ بذاتِ خود ایک توہم پرستانہ نظریہ ہے۔ عقل نے جو خود ساختہ تیقن کی فضا پیدا کی ہے۔ اس کے پیچھے بے یقینی کے سائے لہرا رہے ہیں جو اپنی لاج رکھنے کے لئے کسی بھی فلسفہ سے مصالحت کرنے کو تیار ہیں۔

ہمارے سامنے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان ایمان کے بغیر زندگی گزار سکتا ہے یا نہیں؟

کیا نوزائیدہ کو ماں کے پستان پر ایمان کی ضرورت ہے؟

کیا ہمیں اپنی ذات اور ان لوگوں پر جن سے ہم محبت کرتے ہیں، ایمان کی ضرورت ہے یا نہیں؟

کیا ہمیں زندگی کے روزمرّہ معمولات پر ایمان رکھنا چاہیئے یا نہیں؟

میرے خیال میں اگر انسان کا کسی چیز پر بھی ایمان نہ ہوگا تو وہ نا امید اور بے بس ہو جائے گا اور اپنی ذات سے بھی خوف کھانے لگے گا۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہوا کہ صدیوں کی ایمان کے خلاف جدوجہد بیکار تھی اور عقل کی تمام تر کامیابیاں فضول تھیں؟

کیا ہمارے پاس صرف دو ہی راستے ہیں؟ یا تو مذہب کی طرف واپس چلے جائیں گے اور یا بغیر ایمان کے زندہ رہیں؟

کیا ایمان صرف خدا اور مذہب پر ہی ہو سکتا ہے اور کیا ایمان ہر حال میں عقل کے خلاف ہی ہوتا ہے؟

میں کوشش کروں گا کہ ان سوالوں کا جواب دوں۔

میرے خیال میں ہم ایمان کو ایک انداز فکر، زندگی کو ایک خاص طریقے سے دیکھنے کی عادت سے اور ایک مخصوص رویے کے طور سے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ خاص رویہ انسان کی شخصیت کا ایک رُخ ہوتا ہے اور اُسے زندگی کے حقائق سے نبرد آزما ہونے اور اسے سمجھنے میں مدد کرتا ہے ___ اور اگر ہم ایمان کو مخصوص رویے اور ایک اندرونی تیقن کی کیفیت کے طور پر قبول کر لیں تو پھر کسی خاص چیز، ذات یا نظریے پر ایمان لانا ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

ایمان کو سمجھنے میں ہمیں ایک اور چیز مدد دے سکتی ہے اور وہ شک کو سمجھنا ہے۔ شک کے بارے میں اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا تعلق کسی چیز، ذات یا نظریے سے ہے۔ میرے خیال میں ہم شک کو بھی ایک اندازِ فکر اور مخصوص رویّے کی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اگر ہم یہ بات قبول کر لیں تو پھر باتیں اور نظریات ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

شک کا رویہّ دو طرح کا ہو سکتا ہے۔

معقول شک ___ وہ شک جو مدلّل ہو اور عقل پر مبنی ہو۔

غیر منطقی شک ___ ایسا شک جس کی باتیں عقل کی سمجھ میں نہ آئیں۔

غیر منطقی شک صرف ایک عقلی ردِعمل ہی نہیں، بلکہ اس کے اثرات شخصیت کے ہر گوشے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایسا رویہ رکھنے والا شخص زندگی کی ہر چیز اور پہلو کو شک اور بے یقینی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اُسے زندگی کی کسی چیز پر یقین نہیں آتا۔ بعض دفعہ یہ کیفیت اتنی سنگین ہو جاتی ہے کہ وہ شخص فیصلہ کرنے کی طاقت کھو بیٹھتا ہے۔ اس کے لئے ہر چھوٹا مسئلہ ایک پہاڑ بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی تقریب میں جانے کا فیصلہ کرنا اور کپڑوں کا انتخاب کرنا بھی وبالِ جان بن جاتا ہے۔ یہ رویہ چاہے چھوٹی چیزوں کے بارے میں ہو یا بڑے مسائل کے بارے میں بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔

تحلیلِ نفسی ہمیں اس بارے میں بتاتی ہے کہ اس قسم کا رویہ اس شخص میں نظر آتا ہے جس کی شخصیت کی اندرونی تہوں میں بہت زیادہ مجبوری اور لاچاری کا احساس ہو اور جس کی شخصیت کے مختلف حصوں میں مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔ اس غیر منطقی شک کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس احساسِ مجبوری کی جڑوں کو سمجھیں، تا کہ ان عوامل کو پہچان سکیں جو کسی شخص کی زندگی کو مفلوج کرنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

آج کے دور میں شک کے اس منفی رویّے نے معاشرے میں عجیب و غریب بے حسی کی کیفیت پھیلا رکھی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ دُنیا میں ہر چیز ممکن ہے۔ زندگی میں کچھ بھی یقینی نہیں۔ لوگ اپنی ذات، ماحول،، کام، سیاست الغرض ہر چیز کے بارے میں بے یقینی کا شکار ہیں اور المیہ یہ کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہی زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ ان کے دن رات مشینوں کی طرح گزرتے ہیں۔ نہ تو ان کے خیالات اپنے ہیں نہ جذبات، ان کا ہر عمل مصنوعی لگتا ہے۔

انسانی شعور کا ارتقا

آخر اس منفی رجحان کا علاج کیا ہے؟

میرے نزدیک اس کا ایک حل ’’ایمان‘‘ جو شکوک کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے۔

اس غیر صحت مندانہ شک کے مقابلے میں ایک مثبت شک کا روّیہ ہے جس سے انسان اپنی ذات اور تجربے پر اعتماد کرتے ہوئے آمریت کو چیلنج کرتا ہے۔ اس قسم کا شک انسانی شخصیت کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

انسان بچپن میں والدین کی ہر بات، ہر خیال اور ہر نظریے کو بغیر سوال کیے قبول کر لیتا ہے۔ لیکن جب وہ جوان ہوتا ہے تو ایک ناقدانہ روّیہ اختیار کرتا ہے۔ وہ تمام چیزیں جو اس نے بغیر سوال کیے اپنائی تھیں، اب سوچ سمجھ کر قبول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بچے کے لئے ناقدانہ رویہّ اختیار کرنا اس کی شخصیت کی نشوونما اور ذہنی بلوغت حاصل کرنے کی جدوجہد کی ایک کڑی ہے۔

تاریخی طور پر یہ صحتمندانہ مدلّل شک ہی وہ اندازِ فکر تھا، جس نے جدید فلسفے اور سائنس کو جنم دیا اور فرسودہ خیالات سے نجات حاصل کی۔ یہی وہ روّیہ تھا، جس سے معاشرے نے گرجوں اور حکومت کی غیر ضروری حاکمیت کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔

چنانچہ چاہے وہ انسان کی ذاتی زندگی ہو یا معاشرے کی اجتماعی زندگی، ناقدانہ روّیہ اور صحتمندانہ شک بلوغت کی طرف قدم بڑھانے کا نام ہے۔

اب ہم دوبارہ ایمان کی طرف آتے ہیں ___ میرے خیال میں ایمان بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔

صحتمندانہ اور معقول ایمان

غیر صحتمندانہ اور غیر منطقی ایمان

غیر منطقی ایمان سے میری مراد ایسا ایمان ہے جس میں انسان کسی خیال، نظریہ یا علامت پر ایمان تو لے آئیں لیکن اس ایمان کا ان کے اپنے تجربے، جذبات اور خیالات سے تعلق نہ ہو۔ یہ صورتِ حال اکثر اوقات کسی بڑی طاقت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اس بات کو آگے بڑھائیں، چند لمحوں کے لئے رُکتے ہیں اور اس بغیر سوچے سمجھے، سرِ تسلیم خم کرنے کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے پاس اس بات کا

کافی ثبوت ہے کہ جس شخص نے اپنی انفرادیت اور اعتماد کھو دیئے ہوں وہ دوسروں کی آراء جو بے سوچے سمجھے قبول کر لیتا ہے۔ ہم اس عمل کی جھلکیاں ہپناٹزم میں دیکھتے ہیں۔ اس کیفیت میں ایک شخص ہپناٹک نیند میں دوسرے کے خیالات قبول کرتا ہے اور اسے اپنا سمجھتا ہے۔ دوسرا شخص اس کے خیالات و جذبات پر قابو پالیتا ہے اور جو چاہے اس سے کروالیتا ہے۔ مثال کے طور پر اس ہپناٹک خواب کی حالت میں اسے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ تم ہپناٹزم سے جاگنے کے ایک گھنٹہ بعد کوٹ پہن لینا۔ وہ شخص جاگنے کے ٹھیک ایک گھنٹہ بعد اُٹھ کر کوٹ پہن لیتا ہے اور اگر آپ اس سے پوچھیں کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو تو وہ کہے گا کہ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ وہ مطمئن ہوگا کہ یہ اس کا اپنا ارادہ اور خیال ہے اور اس کا ہپناٹک مشورے سے کوئی تعلق نہیں۔

ہپناٹزم تو کسی کے فیصلوں کو کلی طور پر قبول کرنے اور کسی کی حاکمیت کے آگے سر جھکانے کی عمدہ مثال ہے، لیکن اس عمل کی کمتر درجہ کی مثالیں دیگر حالات میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لیڈر اور رہنما جس کی باتوں میں بہت اثر ہو اور وہ مسحور کرنے والی تقریریں کرتا ہو، اُس کے سامعین جذباتی طور پر اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور اس کے خیالات کو بغیر سوچے سمجھے اور بغیر تنقیدی نگاہ سے دیکھے، قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ اس خود فریبی اور سراب کا شکار ہوتے ہیں کہ وہ اس مقرر سے متفق ہیں، اس لئے وہ ان خیالات کو قبول کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت میں معاملہ اس کے بالکل اُلٹ ہوتا ہے۔ چونکہ وہ اس لیڈر کے سحر میں آ کر اسے قبول کر لیتے ہیں، اس لئے وہ اس کے خیالات بھی مان لیتے ہیں۔ اس مقرر کی سحر بیانی نے اُن پر آدھا ہپناٹزم کر لیا ہوتا ہے۔

ہٹلر نے اس عمل سے بہت فائدہ اُٹھایا تھا۔

ایسے غیر صحتمندانہ ایمان کے لئے اس فقرے: ''میں اس پر اس لئے ایمان لاتا ہوں، کیونکہ وہ لغو ہے۔'' میں بہت سی صداقت ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی ایسی بات منواتا ہے، جو عقل کے خلاف ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس کی ذات میں ایسا سحر ہے جس سے اس کو باقی لوگوں پر بالادستی حاصل ہے۔ آسمانی کتابوں میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ موسیٰ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ معجزے دکھائے تاکہ اس کے پیروکار خدا پر ایمان لا سکیں۔ یہ معجزہ دکھانے کا عمل بذاتِ خود کسی صحتمندانہ ایمان کو غیر صحتمندانہ

انسانی شعور کا ارتقا

بنانے کے لئے کافی ہے۔ جب بھی مسحور کرنے والے اور پُر اسرار معجزوں کا اظہار ہوتا ہے، اُس کا انسان کی عقل اور اس کے اپنے تجربات سے کوئی رشتہ نہیں رہتا۔

موجودہ دور میں اس غیر منطقی ایمان کی مثال ایسے آمروں اور حاکموں کی پیروی ہے، جن کے لاکھوں پیروکار ہیں، جو اُن کی ہر بات کو مانتے ہیں اور ان کے حکم پر تن من دھن کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اگر آپ کسی پیروکار سے اس پیروی کی وجہ پوچھیں تو وہ باقی لاکھوں پیروکاروں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اگر ایمان کسی کی اندھی تقلید ہی کرنا ٹھہرا تو پیغمبروں کی تقلید کرنے والوں میں جو انصاف اور محبت پھیلانے والے ہیں اور ان کے مخالفین کی تقلید کرنے والوں میں جو ذاتی جاہ و جلال اور طاقت کے خواہاں ہیں، میں زیادہ فرق نظر نہیں آتا ___ عمل وہی ہے ___ فرق اتنا ہے کہ انہوں نے اندھی تقلید کرنے کے لئے مختلف لوگوں کو چُنا۔

اسی طرح آزادی کی نگہبانی کرنے والے اور ظلم و تشدد کا پرچار کرنے والے اگر وہ بغیر سوچے سمجھے کسی کی پیروی کر رہے ہیں، تو ان کی اندرونی کیفیت ایک سی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انہوں نے اندھی تقلید کرنے کے لئے مختلف خیالات کا انتخاب کیا ہے۔

غیر صحتمندانہ ایمان اس وقت جنم لیتا ہے، جب کوئی انسان کسی غیر معقول طاقت کو بغیر تنقید کے قبول کرے اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک دے۔

اب ہم دوبارہ صحتمند ایمان کی طرف آتے ہیں۔ یہ ایمان انسان کے اپنے ذہنی اور جذباتی تجربات پر مبنی ہوتا ہے۔ مدلل طرزِ فکر میں معقول ایمان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک سائنسدان ایک نئی حقیقت کیسے دریافت کرتا ہے؟ کیا وہ تجربے کیے جاتا ہے اور معلومات جمع کرتا رہتا ہے، جہاں تک کہ وہ مطلوبہ چیز دریافت کر لے؟ نہیں ایسا نہیں ہوتا۔

زندگی کے ہر شعبے میں تخلیقی عمل کے لئے ایک خصوصی نظر کی ضرورت ہوتی ہے جو انسان کے ماضی کے تجربات پر مبنی ہوتی ہے۔

ایک محقق جب کسی تحقیق کا آغاز کرتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک مقصد ہوتا ہے، مستقبل کا ایک اشارہ ہوتا ہے، وہ جانتا ہے کہ وہ کس چیز کی تلاش میں ہے۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے حقائق اور معلومات جمع کرتا ہے، ان کی جانچ پڑتال کرتا ہے، ان کے مختلف اثرات

پر غور کرتا ہے، وہ معلومات جو اس کی فکر کے لئے ممد ثابت ہوتی ہیں، اُن کو یکجا کرتا ہے اور آخر میں ایک فارمولا یا تھیوری یا اصول پیش کرتا ہے، جو علم میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

سائنس کی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ کوپرنیکس، کیپلر، گیلیلیو، نیوٹن؛ ان سب کا مدلل سوچ پر ایمان تھا۔ انہوں نے علم میں جو اضافے کئے وہ اس ایمان کے بغیر ممکن ہی نہ تھے۔ یہ علیحدہ بات کہ انہیں اس راہ میں بہت سی قربانیاں دینی پڑیں۔ برونو کو جلا دیا گیا۔ سپینوزا کو جلاوطن کر دیا گیا۔

کسی بھی محقق کے لئے تحقیق کی ابتدا سے انتہا تک پہنچنے کے لئے ہر قدم پر اس ایمان کی ضرورت ہے۔ یہی ایمان اس تحقیق کو معنی دیتا ہے، اسے ثابت کرنے میں ممد ثابت ہوتا ہے اور لوگوں کے قبول کرنے کے مرحلے تک انتظار کرنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ یہ ایمان، انسان کے اپنے تجربات، خود اعتمادی، اپنی صلاحیتوں اور اپنی نظر پر یقین رکھنے سے وجود میں آتا ہے ___ چنانچہ یہ ایمان اس ایمان سے بہت مختلف ہوتا ہے جس میں انسان بہت سے نظریات کو اس لئے قبول کر لیتا ہے کہ سب لوگ اسے مانتے ہیں یا وہ کسی حاکم کا فرمان ہیں ___ یہ ایمان انسان کی اپنی سوچ، مشاہدے اور بصیرت کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔

جب صحتمندانہ ایمان نشوونما پاتا ہے تو انسان اپنی ذات پر اعتماد کرنا سیکھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جب حالات بدلتے ہیں تو ماحول کے بارے میں ہمارے تصوّرات بدلتے ہیں، لیکن ہماری ذات کا ایک حصّہ نہیں بدلتا۔ ہم اس حصّے کو "میں" کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس پر ہماری شناخت کا دارومدار ہوتا ہے۔ اگر ہمارا اپنی ذات پر ایمان نہ ہو تو ہم اپنی شناخت کے لئے بھی دوسروں کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ وہی شخص دوسروں کے لئے وفادار ثابت ہو سکتا ہے، جس کا اپنی ذات پر ایمان ہو کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ مستقبل میں ان باتوں پر عمل کرے گا، جسے وہ حال میں کہہ رہا ہے۔ اسی خاصیت سے وعدہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے نیٹشے نے کہا تھا کہ انسان وعدہ کرنے کی خاصیت سے پہچانا جاتا ہے۔

صحتمندانہ ایمان کا تعلق صرف انسان کی اپنی ذات سے ہی نہیں انسانی رشتوں سے بھی ہے ایک دوستانہ اور محبت بھرے رشتے کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے۔ کسی اور شخص پر "ایمان" لانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس کی صلاحیتوں اور اس کے بنیادی رویوں پر یقین

رکھیں۔ اگر وہ مخلص اور ہمدرد انسان ہے تو اس پر اعتبار کریں۔ انسانیت کا احترام بھی اسی جذبے سے وجود میں آتا ہے۔

ایمان کا ایک اور رُخ بنی نوع انسان کی خفیہ صلاحیتوں پر یقین رکھنا ہے۔ اس کی عمدہ مثال ایک ماں کا رویّہ اپنے نوزائدہ بچے کی طرف ہے۔ ماں کا ہر عمل اس یقین کی ترجمانی کرتا ہے کہ اس کا بچہ زندہ رہے گا، پلے بڑھے گا، بات کرنا سیکھے گا، اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے گا اور جوان ہوگا۔ یہ ایمان روزمرّہ کے معمولات میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ بعض دفعہ اس ایمان کا احساس نہیں رہتا۔ جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ بچے کے اندر کچھ اور صلاحیتیں بھی ہوتی ہیں، جن کی خاص نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچے کا بڑا ہو کر ایک عاقل و بالغ یا ایک فنکار بننا اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ جو لوگ اس کی نگہداشت کر رہے تھے، کیا انہیں بچے کی ان خفیہ صلاحیتوں پر ایمان تھا یا نہیں؟ یہ ایمان ہی وہ خاصیت ہے جس سے ہم اچھی اور بُری تربیت میں تمیز کر سکتے ہیں۔ اچھی تعلیم و تربیت کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ بچہ خیر و شر میں تمیز کر سکے۔

بعض لوگ ایمان کے بارے میں ایک اور غلط فہمی کا شکار ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ایمان صرف انتظار کا نام ہے، جس میں انسان کی آرزوئیں خود بخود پوری ہو جاتی ہیں اور خواب بغیر عمل کے شرمندۂ تعبیر ہو جاتے ہیں یہ ایمان کی بہت سطحی سمجھ ہے۔

ایمان کی حقیقت سمجھنے والے پہلے عمل کرتے ہیں، اپنی قوتوں پر اعتماد رکھتے ہیں اور پھر ان اعمال کے نتائج کا انتظار کرتے ہیں۔ عمل کے بغیر ایمان مثبت رویہ نہیں ہو سکتا۔ ایک یہودی کہاوت ہے کہ جب موسیٰ نے پانی میں عصا پھینکا تھا تو پانی پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا، لیکن جب ان کے پہلے مجاہد نے پانی میں قدم رکھا تھا تو سمندر نے دل کھول کر راستہ دے دیا تھا۔

اس طویل بحث کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ روایتی طور پر جب لوگ ایمان کی بات کرتے ہیں تو وہ چیزوں، خیالات اور نظریات پر ایمان لانے کا سوچتے ہیں۔ لیکن ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایمان ایک خاص اندازِ فکر اور زندگی کا رویہ بھی ہو سکتا ہے۔

یہ ایمان دو طرح کا ممکن ہے۔

ایک ایمان کسی بڑی طاقت کے فرمودات کو کلیتہً قبول کرنے کا نام ہے جو ایک غیر صحتمندانہ اور غیر منطقی رویہ ہے کیونکہ اس طرح اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لایا جاتا۔ ایسا

ایمان انسان کی ترقی اور نشوونما میں مد ثابت نہیں ہوا۔ ہر وہ مذہب یا سیاسی نظریہ جس نے عقل، فہم و فراست اور انسانی تجربے کی بجائے جبر اور حاکمانہ رویہ اختیار کیا۔ انسانی تاریخ اور ارتقاء نے اس کے اثرات کم کر دیئے۔

جب ایمان کا تعلق کسی شخص کی اپنی ذات سے نہیں ہوتا، وہ ایمان صحتمندانہ نہیں کہلایا جاسکتا، چاہے وہ نظریات بذاتِ خود کتنے ہی عمدہ اور احسن کیوں نہ ہوں۔ کسی شخص کا محبت، خلوص اور انصاف پر اس لئے ایمان لانا کہ باقی سب لوگ ایسا سمجھتے ہیں اور اُسے یہی بتایا گیا ہے، کوئی مثبت رویہ نہیں۔ یہی حال مذہبی، غیر مذہبی اور سیاسی نظریات کا ہے۔ اگر کسی شخص نے جمہوریت یا آزادی کو سوچ سمجھ کر قبول نہیں کیا تو اس شخص میں اور اس شخص میں جو ایک مذہبی خدا پر ایمان لاتا ہے، کوئی فرق نہیں، جس کا ذاتی تجربات سے کوئی تعلق نہ ہو۔

دوسرا ایمان ایک مثبت قدر ہے۔ ایسا ایمان انسان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے اور سوچ سمجھ کر قبول کیا ہوتا ہے، اس لئے ایسا ایمان معقول اور صحتمند کہلایا جاسکتا ہے۔

المختصر یہ کہ میرے خیال میں انسان ایمان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ آج کا انسان کس قسم کے ایمان کو ترجیح دیتا ہے ___ کیا وہ آمروں، حاکموں اور مذہبی رہنماؤں کے آگے بغیر سوچے سمجھے سرِ تسلیم خم کرنے کو پسند کرتا ہے اور ایک مشین کی طرح زندگی گزارنا چاہتا ہے یا اپنے مشاہدات اور تجربات پر اعتماد کرتے ہوئے زندگی کا ایک مثبت نظریہ قائم کرنا چاہتا ہے اور پھر اس نظریے کے تحت اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیاں گزارنا چاہتا ہے۔

(ایرک فرام کی کتاب Man for Himslelf کے مضمون کا ترجمہ)

سیکولر ہیومن ازم Secular Humanism

تحقیق: ڈاکٹر خالد سہیل، ترجمہ: رفیق سلطان اور ڈاکٹر خالد سہیل

تعارف:

اپنی پرواز کا اندازہ لگانے کے لئے
اپنے ماحول سے آزاد فضائیں مانگیں

میں نے اپنے بچپن میں ایک کہانی سنی تھی جس میں ہندوستان کے ایک نوے سالہ بزرگ آم کا درخت لگا رہے تھے۔ ان سے کسی شخص نے پوچھا 'بابا جی! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ آم کا درخت سات سال کے بعد پھل دیتا ہے۔ جب تک اس درخت پر پھل لگے گا آپ زندہ نہیں ہوں گے۔ تو پھر آپ یہ درخت کیوں لگا رہے ہیں؟' بزرگ کے چہرے پر ایک مشفقانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ فرمانے لگے 'یہ درخت میرے پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں کے لئے ہے'۔

چاہے وہ آم کے درخت ہوں یا علم و آگہی کے، ان کے پھل وہ محبت بھرے تحفے ہیں جو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ جب میں کالج کا طالبعلم تھا تو اپنے چچا سے زندگی، مذہب اور ادب کے بارے میں تبادلہِ خیال کیا کرتا تھا اور اب جبکہ میرا بھانجا کالج میں ہے وہ مجھ سے ان ہی مسائل پر تبادلہِ خیال کرتا رہتا ہے۔ مجھے اپنی کتاب کا یہ باب لکھنے کی تحریک اسی نے دی۔ میری نگاہ میں میرا بھانجا اگلی نسل کا نمائندہ ہے اور پچھلی تمام نسلوں کے علم و عرفان کا وارث۔

****

پیارے بھانجے ذیشان!

پچھلی دفعہ جب میں آپ لوگوں سے ملنے پاکستان آیا تھا تو مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت

ہوئی تھی کہ تمہاری فلسفے میں دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ کالج جاتے ہوئے ایک صبح تم نے مشورہ دیا تھا کہ ہم شام کو کسی رستورانٹ میں جائیں' کھانا کھائیں اور مختلف موضوعات پر سنجیدگی سے تبادلہِ خیال کریں۔ اس شام جب ہم رستورانٹ کی طرف جا رہے تھے تو مجھے اپنی نوجوانی کی وہ شام یاد آ رہی تھی جب میں نے اپنے چچا کے ساتھ ایک اہم شام گزاری تھی۔ میں نے اس شام کا ذکر کنیڈا کے سی بی سی ریڈیو **CBC Radio Canada** کی جرنلسٹ سواد شارابانی کے انٹرویو میں ان الفاظ میں کیا تھا' ان دنوں میں اپنے والدین کے ساتھ پشاور میں رہتا تھا اور میرے شاعر چچا عارف عبدالمتین لاہور میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ وہ ہم سے ملنے پشاور آئے۔ اس وقت تک انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ان کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اور خود بھی نظمیں' غزلیں اور افسانے لکھتا ہوں۔ ایک شام وہ مجھے پشاور صدر کے گرینز ہوٹل **Green's Hotel** لے گئے جہاں ہم نے پرتکلف چائے پی اور کافی دیر تک بے تکلفی سے تبادلہِ خیال کرتے رہے۔ اس شام میرے چچا نے میری باتوں کو ایک بچے کی طرح نہیں بلکہ ایک عاقل و بالغ نوجوان کی طرح سنا۔ میں نے ان سے مذہب اور سائنس کی تعلیمات کے درمیان تضادات کا کھلم کھلا اظہار کیا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ جب میں بزرگوں سے ان تضادات کا ذکر کرتا ہوں تو وہ مجھے اندھے ایمان کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس طرح میرے نفسیاتی تضادات خاندانی' سماجی اور معاشرتی تضادات بن جاتے ہیں اور میں بہت پریشان ہو جاتا ہوں۔

میرے چچا نے میری کہانی بڑے صبر و تحمل سے سنی۔ پھر ان کے چہرے پر ایک مشفقانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ فرمانے لگے' تمہارا ددھیال ایک ایسا خاندان ہے جس میں بہت سے لوگوں نے غیر روایتی زندگی کو اپنایا ہے۔ میرے چچا' تمہارے دادا نے روایتی اندازِ فکر کو ساٹھ سال کی عمر میں چھوڑا تھا' میں نے چالیس برس کی عمر میں خیر باد کہا تھا اور اب تم بیس برس کی عمر میں روایت کا راستہ چھوڑ رہے ہو۔ میں تمہیں ایسا قدم اٹھانے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم اپنی میڈیکل کالج کی تعلیم مکمل کر لو۔ ڈاکٹر بننے کے بعد تمہیں معاشی آزادی مل جائے گی اور تم اپنی مرضی سے اپنا فلسفہِ حیات اور طرزِ زندگی اپنا سکو گے۔ پھر تم روایت کی شاہراہ چھوڑ کر پوری آزادی سے اپنے من کی پگڈنڈی پر چل سکو گے۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے

انسانی شعور کا ارتقا

جس میں منزل سے زیادہ راستہ اہم ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم صحیح راستے پر ہو اور ایک دن تم اپنی غیر روایتی زندگی میں کامیاب ہو گے۔ میں تمہاری ہر موڑ پر حوصلہ افزائی کرتا رہوں گا'۔

چچا جان سے اس شام کی ملاقات کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میرے دل سے ایک بھاری بوجھ اٹھ گیا ہو۔ اس گفتگو کے بعد میں نے کافی سبک محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میں ایک پرندہ ہوں جسے یہ نوید ملی ہو کہ وہ ایک دن پنجرے سے نکل کر کھلے آسمان میں پرواز کر سکے گا۔

میرے چچا جان نے کہا کہ ہر قوم میں چند ایسے شاعر' ادیب' فلاسفر اور دانشور ہوتے ہیں جو غیر روایتی راستے اپناتے ہیں اور بعض دفعہ ان کے اس جہانِ فانی سے گزر جانے کے بعد ان کی قوم کو ان کے خیالات اور نظریات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پیارے ذیشان! اس شام جب ہماری ملاقات ہوئی تو تم نے مجھ سے خدا' مذہب' پیغمبروں' آسمانی کتابوں' اخلاقیات اور انسان دوستی کے فلسفے **Humanism** کے بارے میں بہت سے سوالات پوچھے۔ میں اس خط میں ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

ہیومن ازم

میں نے ہیومن ازم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اپنی ایک کتاب کے دیباچے میں ان الفاظ میں کیا تھا' انسانیت اب اپنے ارتقا کے سفر میں ایک ایسے دوراہے پر آ پہنچی ہے جہاں انسانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر چند اہم فیصلے کرنے ہیں۔ ایک راستہ تباہی و بربادی اور اجتماعی خودکشی کی طرف جاتا ہے اور دوسرا آشتی کی طرف جہاں سب انسان اور قومیں مل کر امن و سکون کی زندگی گزار سکیں گے۔ امن کا راستہ اپنانے والے

اپنی ذات کے ساتھ
دوسرے انسانوں کے ساتھ
اور دھرتی ماں کے ساتھ
آشتی کی زندگی گزاریں گے۔

میں اس دن کے خواب دیکھتا رہتا ہوں جب ساری دنیا میں سب انسانوں کو' چاہے وہ

بچے ہوں یا بوڑھے' عورتیں ہوں یا مرد' صحتمند لوگ ہوں یا جسمانی اور ذہنی طور پر بیمار' اکثریتیں ہوں یا اقلیتیں' برابر کے حقوق اور مراعات حاصل ہوں گے' جب انسان رنگ' نسل' زبان اور مذہب کے تعصبات سے بالاتر ہو کر ایک دوسرے کو گلے لگا لیں گے اور جب لوگ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب' پہلی اور تیسری دنیا کے درمیان ہونے والی جنگوں سے اوپر اٹھ کر یہ جان لیں گے کہ ہم سب انسان ہیں اور ایک ہی خاندان کا حصہ ہیں اور ہمارے دشمن بھی ہمارے دور کے رشتہ دار ہیں۔ ہم سب کے مستقبل کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ اگر ہم سب انسان ایک دوسرے سے تعاون نہیں کریں گے تو ہم سب مٹ جائیں گے۔ میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ یہ میرے ذاتی اور اجتماعی خواب ہیں لیکن شرمندہ تعبیر ہونے سے پہلے خواب دیکھنا ضروری ہے۔ اگر ہمارے خواب تباہ و برباد ہو گئے تو ہم بھی ایک دن تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ہمارے خواب ہی ہمیں ایک بہتر مستقبل بنانے کی تحریک دیتے رہتے ہیں اور میرے خواب امن' آشتی اور انسان دوستی کے خواب ہیں۔

خدا

ایک وہ دور تھا جب میں ایک ایسے خدا پر ایمان رکھتا تھا جو ساتویں آسمان پر لاکھوں سالوں سے رہ رہا تھا۔ میرے ذہن میں خدا کا تصور ایک بزرگ باریش مرد کا تصور تھا جو ایک تخت پر براجمان تھا اور اس کے چاروں طرف بیسیوں فرشتے تھے جو اس کے احکامات کے منتظر تھے۔ وہ خدا تمام انسانوں کی دعائیں سنتا تھا اور دن رات ان کے مسائل حل کرتا تھا۔ میرا ایمان تھا کہ وہ اس کائنات کا خالق تھا اور اس کائنات کا ایک پتہ بھی اس کی مرضی کے بغیر نہ ہلتا تھا۔

لیکن جوں جوں میرا سائنس' نفسیات اور انسانی تاریخ کا علم بڑھا اور میں نے زندگی اور کائنات کے مسائل کے بارے میں غور و خوض کرنا شروع کیا تو میرے خیالات اور نظریات میں تبدیلیاں آتی گئیں۔ مجھے آہستہ آہستہ اس حقیقت کا اندازہ ہوا کہ ہم سب انسان دو دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ایک دنیا حقیقت کی مادی دنیا ہے اور دوسری دنیا خیالی ہے جو ہمارے تصورات کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ دنیا تجریدی اور علامتی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جو شاعری' کہاوتوں اور لوک ورثہ کو جنم دیتی ہے۔ جب ہم لوک ورثہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں مختلف تہذیبوں کی نفسیات سمجھ آتی ہے اور ان کی ثقافت کے بارے میں بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

جب ہم مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں میں خدا کے تصور کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے مختلف معاشروں میں خدا کا تصور جدا جدا تھا۔

کئی تہذیبوں میں خدا مردانہ فوقیت کا حامل تھا اور کئی تہذیبوں میں وہ صنفِ نازک دیوی کا روپ دھارے براجمان تھا۔ کچھ میں خدا سخت گیر اور جابر تھا اور کچھ میں شفیق اور مہربان۔

کچھ کلچرز میں خدا ایک غیر مرئی حقیقت تھا جبکہ بعض میں وہ انسانوں کے بنائے ہوئے بتوں کی شکل میں ایستادہ تھا۔

کچھ کلچرز میں خدا کو خالق کا درجہ حاصل تھا جس کے بارے میں گمان اغلب تھا کہ وہ کائنات سے باہر کہیں جلوہ افروز ہے۔ وہاں کے لوگ 'ہمہ از اوست' کے فلسفے کو مانتے تھے جب کہ بعض 'ہمہ اوست' کے فلسفے کے پیروکار تھے۔

بعض تہذیبوں میں لوگوں کا خیال تھا کہ خدا انسانوں کے دلوں میں بستا ہے اور ہمیں اس کا ادراک حاصل کرنے کے لئے باہر کہیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور بعض تہذیبوں میں لوگ یہ یقین رکھتے تھے کہ ہم سب خدا کے جمال کے پرتو ہیں اور آہستہ آہستہ خدا کا روپ دھار رہے ہیں۔

مذاہب عالم اور دیومالائی کہانیوں کے تقابلی موازنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کہنا کہ خدا نے انسان کو اپنے روپ میں پیدا کیا ہے دراصل حقیقت کی صحیح غمازی نہیں کرتا بلکہ یہ کہنا زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ انسان نے خدا کے تصور کو تخلیق کیا ہے۔ اور اسے اپنی تمام تر صلاحتیں اور جواہر دے کر فوق البشر قرار دے دیا ہے۔ خدا کو انسان چاہے کسی نام سے پکار لیں' بھگوان کہہ لیں یا اللہ' کائنات کی نادیدہ طاقت کہہ لیں یا نور' وہ سب نام اور تصورات انسانوں کی نفسیات' ماحول اور ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ پوری دنیا کھنگالنے کے بعد آپ کو ایسے کوئی دو انسان یا ثقافتی گروہ نہ ملیں گے جن کے خدا کا تصور اور سچ کا تجربہ یکساں ہو۔ میری نگاہ میں ان لوگوں کے خدا کا تصور جو اپنے خوف اور کمزوریوں پر کسی غیر مرئی طاقت کے وسیلے سے قابو پانا چاہتے ہیں خدا کسی ماہر نفسیات کے تجزیاتی سوالنامے **Rorscharch's test** کا روپ دھار لیتا ہے اور وہ لوگ جو اپنے خوابوں اور خواہشوں کی دنیا میں رہتے ہیں ان کے لئے خدا ایک سینٹا کلاز **Santa Claus** کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس سے یہ امید رکھی جاتی ہے کہ

وہ ان گنت تمناؤں کو پلک جھپکتے میں پورا کر دے گا۔

انسان کی زندگی میں بچپن میں تو سانٹا کلاز پر ایمان لانا سمجھ میں آتا ہے جو نت نئے کھلونے مہیا کرنے کا وسیلہ ہوتا ہے لیکن ذہنی طور پر بالغ ہونے کے بعد بہت سے انسان خدا کے تصور کے اس سحر سے باہر آجاتے ہیں اور اپنے خوابوں اور خواہشوں کی تکمیل کے لئے سینٹا کلاز جیسے خدا پر انحصار کرنے کی بجائے اپنے دستِ بازو پر انحصار کرتے ہیں' اپنے اعمال پر اعتبار کرتے ہیں اور اپنی خواہشوں کو خود پورا کرتے ہیں۔

جب میں نے انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا تو مجھے علم ہوا کہ پچھلی چند صدیوں میں خدا کے تصور نے کئی صورتیں تبدیل کی ہیں اور اسے خاصے نشیب و فراز کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اندھی مذہبی عقیدت کو سب سے بڑی رکاوٹ یونانی فلسفیوں کی استدلالی فکر کے باعث پیش آئی اور خدا کو جس جان لیوا مخالفت کا سامنا کرنا پڑا وہ سائنس اور فلسفے کے فروغ سے پیدا ہوئی۔

انسان اور خدا کے رشتے کے حوالے سے مشرق اور مغرب کے تمام فلسفیوں میں سے صرف دو کے افکار کو یہاں پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔

مغرب سے کیرن آرمسٹرانگ **Karen Armstrong** اور مشرق سے جے کرشنا مورتی **J.Krishnamurti** کیونکہ میں ان کے افکار کا بہت احترام کرتا ہوں۔

کیرن آرمسٹرانگ اپنی کتاب 'خدا کی تاریخ' **Histroy of God'** میں انسانوں کے خدا پر ایمان اور اس ایمان میں تضادات کے بارے میں سیر حاصل بحث کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بیسویں صدی میں خاص طور پر ہولوکاسٹ **Holocaust** کے شرمناک المیے کے بعد خدا کے روایتی اور شخصی تصور کو شدید جھٹکے لگے ہیں جس کی وجہ سے کئی روایتی ایمان پرستوں کو اپنے نظریات کی چھان بین کرنی پڑی۔ وہ لکھتی ہیں 'ایک دن ہٹلر کی بدنامِ زمانہ گستاپو نے ایک بچے کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ حتیٰ کہ ایس ایس **SS** کے سپاہی بھی ایک معصوم بچے کو ہزاروں افراد کے سامنے اس طرح پھانسی دینے پر مضطرب ہوئے۔ ایلی ویزل **Elie Weisil** اس حادثے کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ جس بچے کو پھانسی دی گئی اس کا چہرہ ایک غمزدہ فرشتے کی طرح معصوم تھا جو ان جانکسل حالات کی وجہ سے زردی مائل ہو چکا تھا۔ وہ خاموشی سے آہستہ آہستہ قدموں سے پھانسی گھاٹ کی طرف بڑھتا رہا۔ ایک قیدی نے جسے بزور اس بچے کی طرف

دیکھنے پر مجبور کیا گیا تھا سوال کیا کہ اس وقت خدا کہاں ہے؟ اور ویزل نے اپنے دل کے نہاں خانے میں ایک ڈوبتی آواز سنی جو کہہ رہی تھی کہ 'وہ کہاں ہے؟ ارے وہ یہیں ہے اسے یہاں پھانسی کے تختے پر چڑھایا جا رہا ہے۔' ہزاروں یہودی اب خدا کو ماننے سے انکاری ہیں جو ویزل کے کہنے کے مطابق عقوبت خانوں میں سب کے سامنے پھانسی کی بھینٹ چڑھ گیا۔'

کیرن آرمسٹرانگ لکھتی ہیں 'اگر یہ خدا قادرِ مطلق ہوتا تو یقیناً ہولوکاسٹ کو روک سکتا تھا۔ اگر وہ برائی اور ظلم کو روکنے کی صلاحیت سے عاری ہے تو پھر وہ ایک کمزور اور بے کار خدا ہے اور اگر وہ عالم گیر بربادی کو روکنے کی قدرت رکھنے کے باوجود خاموش تماشائی بننا پسند کرتا ہے تو پھر وہ بہت جابر و ظالم ہے۔ دنیا میں صرف یہودی ہی نہیں بلکہ اور لوگ بھی ہیں جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہولوکاسٹ کی بربادی اور ظلم نے خدا کے شخصی تصور اور روایتی مذہبی اقدار کو شدید زک پہنچائی ہے۔'

مشرق کے فلسفی اور صوفی کرشنا مورتی اس خیال کو نمایاں انداز میں پیش کرتے ہیں کہ خدا پر ایمان لوگوں کو تشدد اور ظلم سے باز رکھنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ خدا پر ایمان ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے بہترین محرک ہے تو پھر اس کا انکار چہ معنی دارد؟ تو وہ فرمانے لگے 'آیئے ہم اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کریں اور عقلی دلائل کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ خدا کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ خدا پر کیوں ایمان لاتے ہیں اگر ایمان لانے والوں سے پوچھا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ ان کو اس ایمان سے قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ذہنی سکون نصیب ہوتا ہے۔ زندگی میں معنی پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم معروضی طریقے سے دیکھیں تو ان کی زندگی میں ایمان کی اہمیت رتی برابر بھی نہیں ہے۔ لوگ خدا پر ایمان لاتے ہیں اور استحصال کرتے ہیں۔ ایک آسمانی خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور زمین پر قتل و غارت کرتے ہیں۔ امیر انسان بھی خدا پر یقین رکھتا ہے لیکن بے دردی سے غریبوں کا استحصال کرتا ہے۔ مال و زر اکٹھا کرتا ہے اور کروڑپتی بننے کے بعد ایک مندر تعمیر کر کے سخی داتا اور نیک نام بن جاتا ہے۔ جن لوگوں نے ہیروشیما پر بم گرائے تھے ان کا بھی دعوہ تھا کہ خدا ان کا حامی و ناصر ہے۔ وہ ہوا باز جو انگلستان سے جرمنی کو تباہ و برباد کرنے کے لئے اڑے تھے ان کا بھی دعوہ تھا کہ خدا ان کا

ساتھی پائلٹ co-pilot ہے۔تمام امراٗ وزراٗ جرنیل اور صدر جو خدا کے نام لیوا ہیں اور اس پر دل کی اتھاہ گہرائیوں میں یقین رکھتے ہیں کیا وہ دنیا کے عوام کے لئے ایک بہتر جگہ بنانے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ایسے لوگ جو خدا پر یقین کا دعویٰ کرتے ہیں انہوں نے ہی آدھی دنیا کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے اور ان ہی کی وجہ سے لوگ کسمپرسی کی حالت میں جی رہے ہیں۔'

حتیٰ کہ آج کے دو ہم عصر رہنما جو دنیا کو جہنم کی بھٹی میں جھونکنے میں برابر کے شریک ہیں' ایک مشرق کے اسامہ بن لادن اور دوسرے مغرب کے جارج بش' نہ صرف خدا پر یقین رکھتے ہیں بلکہ دونوں کا دعویٰ ہے کہ خدا ان ہی کے ساتھ ہے۔

پیغمبر

ایک وہ دور تھا جب میرا ایمان تھا کہ تمام پیغمبر خدا کا الہامی پیغام انسانوں تک پہنچاتے ہیں اور انسانوں کو مافوق الفطرت معجزے دکھاتے ہیں۔آہستہ آہستہ مجھے احساس ہوا کہ وہ لوگ ایسے ہمدرد رہنما تھے جو اپنی قوموں کو سنوارنا چاہتے تھے اور ایک منصفانہ نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔وہ چاہتے تھے کہ لوگ مادی دنیا کے جال میں نہ پھنسیں اور ایک درویشانہ زندگی اپنائیں۔ وہ انسانوں کو معرفت کی راہ دکھانا چاہتے تھے۔وہ اس دنیا کے انسانوں کے دکھوں کو کم اور ان کی خوشیوں کو بڑھانا چاہتے تھے۔انہوں نے خود ایسی زندگیاں گزاریں کہ ان کے کرداروں نے بہت سے انسانوں کو انفرادی اور معاشرتی طور پر بہتر زندگی گزارنے کی تحریک بخشی۔

میں نے پیغمبروں' صوفیا اور درویشوں کی شخصیت اور طرزِ زندگی کے بارے میں جو کتابیں پڑھی ہیں ان میں سب سے زیادہ مجھے ایک ماہرِ نفسیات ڈاکٹر رچرڈ بیوک Dr. Richard Bucke کی کتاب آفاقی شعور Cosmic Consciousness نے متاثر کیا ہے۔وہ کتاب مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے بہت سے دوستوں کو اسے پڑھنے کا مشورہ دیا۔ڈاکٹر بیوک اس کتاب میں پیغمبروں' صوفیا اور درویشوں کی زندگیوں کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم زمین پر شعور کے ارتقا کا مطالعہ کریں تو ہمیں احساس ہوگا کہ شعور نے لاکھوں سالوں میں ارتقا کی تین منازل طے کی ہیں۔

شعور کی پہلی منزل سادہ شعور simple consciousness کی تھی جو جانوروں اور پرندوں میں پائی جاتی ہے۔

شعور کی دوسری منزل اپنی ذات کے شعور self consciousness کی تھی۔جب حیوان کو اپنی ذات کا شعور ہوا تو وہ انسان بن گیا۔حیوان جانتے ہیں لیکن انسان جانتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں۔انسانوں کی اس خاصیت نے انہیں زبان تخلیق کرنے کی استطاعت بخشی۔بیوک کا خیال ہے کہ ارتقا کے ابتدائی مراحل میں صرف چند انسانوں کو اپنی ذات کا شعور ہوا ہوگا لیکن آہستہ آہستہ سب انسانوں کو اپنی ذات کا شعور ہوگیا۔

شعور کی تیسری منزل آفاقی شعور cosmic consciousness ہے۔انسانی تاریخ میں صرف چند ایک لوگ اتنے خوش قسمت ہیں جنہیں یہ شعور حاصل ہوا۔بیوک نے جن عظیم لوگوں کے آفاقی شعور کو سراہا ہے ان میں بدھا Buddha سے لے کر والٹ ومین Walt Whitman جیسے تیرہ لوگ ہیں۔بیوک کا خیال ہے کہ انسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ آفاقی شعور رکھنے والے بڑھتے اور روایتی مذاہب کو ماننے والے کم ہوتے جائیں گے۔

بیوک کا خیال ہے کہ ہر معاشرے میں ارتقا کے حوالے سے دو طرح کے انسان پائے جاتے ہیں۔

اعلیٰ درجے کا ذہن رکھنے والے

ادنیٰ درجے کا ذہن رکھنے والے

وہ لکھتے ہیں' ادنیٰ درجے کا ذہن رکھنے والے انسانوں کی شخصیت میں خود اعتمادی' جرات' ہمدردی اور محبت کا فقدان ہوتا ہے۔اس لئے ایسے انسانوں کی زندگی میں خوشی' قناعت اور سکون کی کمی ہوتی ہے۔ان کے مقابلے میں اعلیٰ ذہن رکھنے والے انسانوں کی شخصیت میں خود اعتمادی' جرات' ہمدردی اور محبت وافر مقدار میں ہوتی ہے اس لئے ایسے انسانوں کی زندگی میں خوشی' قناعت اور سکون زیادہ ہوتا ہے۔ایسے انسان خوفزدہ نہیں ہوتے اور اپنے مسائل کا حل خوش اسلوبی سے تلاش کر لیتے ہیں' بیوک پر امید تھے کہ جوں جوں وقت گزرے گا اور انسانیت ارتقا کے مزید مراحل طے کرے گی زیادہ سے زیادہ لوگوں میں آفاقی شعور پیدا ہوگا اور وہ بہتر انسان بنیں گے۔

مذاہب

انسانی تاریخ میں پیغمبروں نے اپنی صداقتیں دریافت کیں اور اپنے دور کے لوگوں کو

بتائیں لیکن ان کے پیروکار اپنے بزرگوں کی طرح دانا نہیں تھے۔ انہوں نے ان صداقتوں کو مختلف روایتوں میں پابند کر دیا اور ان سے مختلف مذاہب بنا دیے۔ ان مذاہب نے پیغمبروں کے الفاظ تو محفوظ کر لئے لیکن ان کی روح کھو دی۔ ان کے پیروکار مولوی' پادری اور پنڈت بن گئے اور لوگوں پر فتوے لگانے لگے اور محبت کا پیغام دینے کی بجائے جہنم کی خبریں سنانے لگے۔ ان مولویوں' پادریوں اور پنڈتوں نے معاشرے میں اتنی طاقت اختیار کر لی کہ وہ عوام کا استحصال کرنے لگے۔

آہستہ آہستہ مختلف مذاہب نے غصے' نفرت اور تلخی کی دیواریں کھڑی کرنی شروع کر دیں۔ کرشنا مورتی لکھتے ہیں 'مذاہب نے انسانوں کو خدا کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ان کو مذہبی جنگوں کے لئے تیار کر لیا ہے تا کہ وہ خدا کے نام پر انسانوں کا خون بہائیں' بعض ان جنگوں کو صلیبی جنگیں crusades کہتے ہیں اور بعض جہاد۔

انسانوں کا المیہ یہ ہے کہ ان پیغمبروں کے پیروکار جو دنیا میں امن لانا چاہتے تھے آج کے دور میں خدا کے نام پر ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ مختلف مذاہب میں پیغمبروں کے جانشین مولویوں' پنڈتوں اور پادریوں سے زیادہ سنت' سادھو' صوفی اور درویش ہیں جو معرفت کی راہ پر چلتے رہتے ہیں اور عوام پر فتوے لگانے کی بجائے انہیں دل سے لگاتے ہیں۔ وہ لوگوں کو مختلف فرقوں میں بانٹنے کی بجائے ایک چھت کے نیچے جمع کرتے ہیں۔

آسمانی کتابیں

ایک وہ زمانہ تھا جب میں آسمانی کتابوں میں زندگی کے مسائل کے بارے میں مجرب نسخے تلاش کیا کرتا تھا۔ اس دور میں میرا خیال تھا کہ ان آسمانی کتابوں میں ایسے قوانین موجود ہیں جن کی روشنی میں ممالک کے دستور بننے چاہئیں۔ ان دنوں مجھے یہ بھی فکر لاحق رہتی کہ اگر میں نے آسمانی وحی پر عمل نہ کیا تو میں واصلِ جہنم ہو جاؤں گا۔

لیکن سائنس' فلسفہ اور ادب کے مطالعہ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ آسمانی کتابوں کی مختلف آیات کی مختلف عالموں نے مختلف ہی نہیں متضاد تفسیریں بھی کی ہیں اور مجھ جیسا طالبعلم 'جو ان زبانوں سے واقف نہیں' کبھی بھی ان کتابوں کا اصل مفہوم نہیں جان سکتا۔ مجھے یہ بھی

اندازہ ہوا کہ مختلف مذاہب میں جو مذہبی جنگیں ہوتی آئی ہیں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بعض فرقے آسمانی کتابوں کا لغوی ترجمہ کرتے ہیں اور بعض علامتی اور استعاراتی۔

اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ آسمانی کتابیں جو اپنے عہد کے حکیمانہ ادب کا حصہ تھیں اب ہمارے لئے لوک ورثہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ وہ کتابیں ہمیں مختلف ثقافتوں کی نفسیات اور سماجیات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ آسمانی کتابوں کو زندگی کے مسائل کے بارے میں غور و فکر کے لئے پڑھنا چاہئے لیکن اس سے ملک کے قوانین نہیں نکالنے چاہئیں۔ وہ کتابیں معرفت کی کتابیں ہیں سیاسی دستاویزات نہیں ہیں۔ یہ بدقسمتی ہے کہ مختلف مذاہب کے مذہبی رہنما ان کتابوں کا استحصال کرتے ہیں اور انہیں اپنے خودغرضانہ سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

اخلاقیات

میں نے زندگی میں جس قدر نیکی اور بدی کے بارے میں غور کیا ہے مجھے اسی قدر اندازہ ہوا ہے کہ بعض نیکیاں اعلیٰ درجے کی ہیں اور بعض ادنیٰ درجے کی۔

میری نگاہ میں سب سے ادنیٰ درجے کی نیکیاں وہ ہیں جو خوف کی وجہ سے کی جاتی ہیں۔ ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے نیکی نہ کی تو انہیں اس دنیا یا آخرت میں سزا ملے گی اور وہ جہنم کی آگ میں جلیں گے۔ مختلف ممالک کی حکومتیں ایسے انسانوں کی نفسیات سے واقف ہیں اسلئے وہ ایسے قوانین بناتی ہیں تا کہ لوگ جیل یا موت کے خوف سے بدی نہ کریں۔

درمیانے درجے کی نیکیاں وہ ہیں جو کسی لالچ کی وجہ سے کی جاتی ہیں۔ چاہے وہ کسی انسان کی خوشنودی ہو یا کسی انعام کی خواہش۔ بعض لوگ تنخواہ کی خواہش اور بعض جنت کی لالچ میں اچھے کام کرتے رہتے ہیں۔

میری نگاہ میں سب سے اعلیٰ درجے کی نیکی وہ ہے جس میں انسان وہ کام کرتے ہوئے خود اس سے تہہ دل سے محظوظ ہوتا ہے اور اسے پر معنی سمجھتا ہے۔ جیسے ایک فنکار فن تخلیق کرتے ہوئے اور ایک ماں اپنے بچے کا خیال رکھتے ہوئے محظوظ ہوتی ہے۔ اس کے لئے وہ کام بذاتِ خود اس کام کا معاوضہ ہوتا ہے۔

میں اکثر اوقات نیکی کی تین سطحوں کو مندرجہ ذیل مثال سے واضح کرتا ہوں۔

تین لوگ خدمتِ خلق کر رہے تھے

پہلا ایک نوجوان تھا جسے جج نے اس کی جرم کی سزا کے طور پر سو گھنٹے خدمتِ خلق کرنے کو کہا تھا۔

دوسرا ایک جوان تھا جو اس لئے خدمتِ خلق کر رہا تھا کہ اسے اس کی بنیاد پر ایک ملازمت مل سکے۔

تیسرا ایک ادھیڑ عمر انسان تھا جو اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے بعد غریبوں کی خدمت کر رہا تھا۔ اسے نہ تو کسی جج نے حکم دیا تھا اور نہ ہی اس نے اس خدمت سے کوئی مسئلہ حل کرنا تھا۔ میری نگاہ میں اس کی خدمت پہلے دونوں انسانوں سے بہتر تھی کیونکہ وہ سو فیصد مخلص اور بے لوث تھی۔

میرا خیال ہے کہ والدین اور اساتذہ کو اپنے بچوں کو ادنیٰ درجے کی نیکی کی بجائے اعلیٰ درجے کی نیکی کرنے کی ترغیب دینی چاہیے۔

پیارے ذیشان!

اب جبکہ میں خدا اور مذہب کو خیر باد کہہ کر انسان دوستی کے فلسفے **Humanism** کو گلے لگا چکا ہوں میری زندگی میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اب میں پہلے کی نسبت

... اپنی ذاتی زندگی اور ماحول سے زیادہ مطمئن ہوں

... اب میں تخلیقی کاموں اور خدمتِ خلق پر زیادہ توجہ دیتا ہوں

... اب میں تمام انسانوں ان کے عقیدوں اور روایتوں کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں

... اب میں نہ صرف مذہب کی آزادی **freedom of religion** بلکہ مذہب سے آزادی **freedom from religion** پر بھی یقین رکھتا ہوں اور

... اب میں محسوس کرتا ہوں کہ مذہب اور عقیدہ ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ جہاں تک سماجی زندگی کا تعلق ہے تمام معاشروں اور حکومتوں کو عقیدوں سے بالاتر ہو کر انسان دوستی کی روشنی میں شہریوں کے لئے قوانین اور روایات وضع کرنی چاہئیں۔ ہمیں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ عورتوں، بچوں اور اقلیتوں کو مردوں کے مساوی حقوق اور مراعات ملیں۔

میں جس زمانے میں خدا اور مذہب پر ایمان رکھتا تھا اور باقاعدگی کے ساتھ مذہبی شعار کی پابندی کرتا تھا اس زمانے میں مجھے حیات بعد الموت کے مذہبی تصور کے تحت جنت الفردوس میں جانے کی شدید خواہش تھی۔ انسان دوستی کے فلسفے کو اختیار کرنے کے بعد میں ایک ایسا انسان بننے کی سعی کرتا ہوں جس کا

... دماغ ایک سائنسدان کی طرح متجسس ہو

... دل ایک شاعر کی طرح جمالیات کا شیدائی ہو

اور

... شخصیت ایک درویش کی طرح امن پسند اور خدمتِ خلق کے لئے بے تاب ہو

میں اب یہ بات خوشی اور فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی خدا اور مذہب کے بغیر بہت ہموار، بامعنی اور شانت گزر رہی ہے۔

عجب سکون ہے میں جس فضا میں رہتا ہوں
میں اپنی ذات کے غارِ حرا میں رہتا ہوں

تمہارا ماموں
خالد سہیل

نوعِ انسانی کے مصائب کے سات اسباب

تخلیق: خالد سہیل ،ترجمہ: امیر حسین جعفری

اکیسویں صدی میں نوعِ انسانی ایک دوراہے پر ہے اور عنفوانِ شباب کی حدوں کو بھی چھو رہی ہے۔ ایٹم بم کی ایجاد کے بعد تاریخِ انسانی میں پہلی بار اجتماعی خودکشی کے دہانے پر بھی کھڑی ہے۔ مجھے امید ہے نوعِ انسانی اپنی تباہی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے ارتقا کی اگلی منزل کا اور امن وآشتی سے زندہ رہنے کے لیے بقائے باہمی کی گزرگاہوں کو انتخاب کرے گی۔
نوعِ انسانی کو اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ بطورِ انسان ہم نہ صرف ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں بلکہ ہمیں بہتر مستقبل کے لیے مشترکہ جدوجہد کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے مصائب میں کمی واقع ہو سکے۔

میں جب انسانی مصائب کے معاصر معاشرتی، معاشی اور سیاسی اسباب کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے درج ذیل سات اسباب دکھائی دیتے ہیں۔

1- طبقات کا مسئلہ Issue of Class

عوام الناس کی اکثریت ایسی آبادیوں یا قومیتوں میں زندگی گزارتی ہے جہاں امیر و غریب طبقے کے درمیان ایک واضح اور وسیع خلیج موجود ہوتی ہے۔ جب ہم اونچے، متوسط اور نچلے طبقے جیسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں تو دراصل ہم اس خلیج کی موجودگی کی تائید کرتے ہیں جو محروم اور مراعات یافتہ طبقوں کے درمیان موجود ہوتی ہے۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ اس دنیا 20 فیصد لوگ تقریباً 80 فیصد وسائل پر قابض ہیں جبکہ 80 فیصد آبادی 20 فیصد وسائل پر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ترقی پزیر اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان یہ خطِ تفریق

حیران کن ہے۔ دنیا کی برسرآوردہ اقلیت کی زندگی تمام آسائشوں سے بہرہ مند ہوتی ہے جبکہ غریب اکثریت غذا اور سر پہ سائبان کی جدوجہد میں گرفتار ہے۔ یہ اکثریت نہ تو بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کر سکتی ہے بلکہ ادویات کی قوتِ خرید سے بھی محروم ہے۔ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ محروم اور مراعات یافتہ طبقوں کو نہ صرف علاقائی بلکہ عالمی سطح پر اس مسئلے کی حقیقت سمجھ لینا چاہیے کہ صحت اور رفاحِ عامہ کے مسائل ہماری مشترکہ ذمہ داری ہیں اور نوعِ انسانی کو ایک ایسا طرزِ زندگی اختیار کرنا ہوگا جس کے سبب کرۂ ارض پر موجود لاکھوں بچے جو ناقص غذا، بھوک اور قابلِ علاج امراض کے باعث مر جاتے ہیں اُن کی زندگی محفوظ ہو سکے۔ ترقی یافتہ ممالک اگر اس مسئلے کی حقیقت کو سمجھ لیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ ترقی پزیر ممالک کی معاشی اور سیاسی خودانحصاری اور آزادی کے حصول کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ ترقی یافتہ ممالک میں ایک طرف کینیڈا جیسے ممالک ہیں جہاں عوام الناس کو معاشرتی معاونت کے نظام کے ذریعے مفت تعلیم اور علاج کی سہولتیں میسر ہیں وہیں اس کے پڑوس یعنی امریکہ میں 30 ملین لوگ علاج کی انشورنس سے محروم ہیں۔

2- رنگ، نسل اور ذات کا مسئلہ Issue of Race and Ethnicity

طبقاتی تفریق کے مسائل کے علاوہ مختلف قومیتوں کے درمیان نسل کی بنیاد پر بھی غیر مساویانہ رویہ پایا جاتا ہے۔ اس امتیازی اور غیر مساوی رویے کی ایک مثال جنوبی فریقہ ہے جہاں سفید فام لوگوں کو نسل در نسل سیاہ فام اور گندمی رنگت کے لوگوں کی نسبت زیادہ حقوق و مراعات حاصل رہے ہیں۔ وہاں سیاہ فام اکثریت پر سفید فام اقلیت حاکم رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی ذات پات کا نظام صدیوں سے رائج ہے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں میں سادات کو دیگر مسلمانوں پر سیادت حاصل ہے۔ ایسے رویے معاشرتی ناانصافیوں اور ناہمواریوں کو جنم دیتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مارٹن لوتھر کنگ جونیر (Junior) کو امتیازی قوانین کے خلاف سخت جدوجہد کرنی پڑی تاکہ سیاہ فام لوگوں سے سفید فام لوگوں کی طرح برابری کا سلوک ہو سکے۔

3- صنف کا مسئلہ Issue of Gender

عہدِ ماضی میں دنیا کے کچھ حصوں میں مادرانہ نظامِ معاشرت قائم تھا اور عورتوں کو عزت کی

نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مادری زبان اور مادرِ وطن کلمات ہمیں اسی عہد کی یاد دلاتے ہیں۔ گزشتہ چند صدیوں سے نوعِ انسانی پدری نظامِ معاشرت میں مصروف بود و باش ہے جہاں عورتوں کو نہ صرف دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ بہت سے حقوق و مراعات سے بھی محروم کر دی گئی ہیں۔ آزادیٔ نسواں کی تحریک عورتوں کے حقوق اور مساوات کے حوالے سے ایک عمدہ قدم تھا مگر پدری نظامِ معاشرت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مردوں کے رویوں کی جڑیں اتنی گہری اور مضبوط ہیں کہ عورتوں کو مردوں کے برابر مقام دینے میں شاید ابھی مزید کئی نسلوں کا سفر درکار ہو۔ یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ تہذیبی و ثقافتی روایات کے ساتھ ساتھ اکثر مذاہب میں کوئی عورت نبوت کی حامل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کسی مذہبی اجتماع کی پیشوائی کے درجے پر فائز ہو سکتی ہے۔

4- مذہب کا مسئلہ Issue of Religion

جہاں کچھ نفوس مذہب کی بنیاد پر خود کو بہتر انسان کے مرتبے پر فائز کرنا چاہتے ہیں اور اپنے اطراف میں بسنے والوں کی خدمت کا فریضہ انجام دینا چاہتے ہیں وہیں کچھ لوگ مذہب کی بنا پر دوسروں کو نہ صرف لائقِ احتساب سمجھتے ہیں بلکہ اپنے تادیبی رویے کا اظہار بھی کرتے ہیں اور ان کی نظر میں جو گنہگار ہیں انہیں کیفرِ کردار تک بھی پہنچانا چاہتے ہیں۔ مذہبی گروہوں کی مختلف فرقوں میں تقسیم اور ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہونا یقیناً ایک المناک منظر نامہ ہے۔ جیسے عراق میں اہلِ تشیع اور اہلِ سنت فرقوں کو متحارب ہونا یا آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی آویزش یا مسلمانوں اور یہودیوں کا اسرائیل میں جنگ و جدال۔ ان سب سیاسی جنگوں کی بنائے فساد مذہب ہے۔ اپنے مذہبی عقائد و تعصبات سے بالاتر ہو کر دہریت اور انسان دوستی Humanism کے پیروکاروں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھنا یا اختلاف الرائے کے باوجود دیگر مذاہب اور فرقوں کے پیروکاروں کو خوش دلی سے قبول کرنا اور انہیں لائقِ معاشرت تصور کرنا عامۃ الناس کی اکثریت کے لیے آج بھی کارِ دشوار ہے کیونکہ ان کی نگاہ میں وہ گنہگار ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اسی طرح مذہبی ریاستوں کا وجود بھی اقلیتی فرقوں کے لیے باعثِ آزار ہے۔ انہیں حکمران ریاستی قوانین کی بنیاد پر سزا و تادیب کا ہدف ٹھہراتے ہیں۔ میری رائے میں وہ وقت آن پہنچا ہے کہ حکومتوں کو گرجے۔ مسجد۔ ریاست کو

جدا رکھنا چاہیے اور ایسی سیکولر ریاستوں اور معاشروں کا وجود عمل میں آنا چاہیے جہاں عام لوگوں کو نہ صرف مذہبی آزادی بلکہ مذہب سے آزادی کا بھی اختیار حاصل ہو۔

5- جنسی ترجیح کا مسئلہ Issue of Sexual orientation

ہم جنس پرستی کے حوالے سے جب بھی دیانتدارانہ گفتگو ہوتی ہے تو بہت سے تعصبات نمودار ہوتے ہیں۔ کچھ معاشرے ہم جنسی کو غیر اخلاقی اور کچھ اسے غیر فطری تسلیم کرتے ہیں اور بعض اسے غیر قانونی تصور کرتے ہیں۔ ہم جنس پسند مرد اور عورتیں صدیوں سے عامۃ الناس کے اس ناروا سلوک اور رویے کے باعث مصائب اور آلام کا شکار رہے ہیں۔ البتہ کچھ ممالک نے حال ہی میں انہیں شادی کے حقوق دیے ہیں اور انہیں یہ اختیار بھی دیا ہے کہ وہ اپنی محبت کا اظہار برسرِ عام کر سکیں۔

6- جسمانی اور ذہنی معذوری کا مسئلہ

Issue of Physical and Mental Disabilities

جسمانی اور ذہنی مریضوں کو نامناسب رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہم سب بارہا اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر افراد کو نہ صرف اپنے افرادِ خانہ کی طرف سے منفی رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ اپنی جائے روزگار پہ تعصبات کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ کینیڈا میں معذور افراد کے لیے گاڑی کی پارکنگ کے لیے مخصوص جگہ اس حوالے سے خوش آئند قدم ہے۔ جوں جوں لوگوں میں آگاہی بڑھ رہی ہے وہ ذہنی و جسمانی طور پر معذور افراد کے ساتھ تادیبی رویے کی بجائے ہمدردانہ رویہ اختیار کر رہے ہیں۔

7- قومیت کا مسئلہ Issue of Nationalism

افراد جہاں پیدا ہوتے ہیں اس ملک کے ساتھ اپنی شناخت جس مضبوطی سے قائم کرتے ہیں اس کا مشاہدہ یقیناً ایک حیران کن تجربہ ہے۔ ان کا جذبہ حب الوطنی نہ صرف انہیں اپنے وطن سے بے اختیار محبت کرنے پر مائل کرتا ہے بلکہ بعض دفعہ پڑوسی ممالک، جنہیں وہ دشمن تصور کرتے ہیں، کے خلاف جنگ کا محرک بھی بنتا ہے۔ اگر جذبہ حب الوطنی کی عمارت مذہب

کی بنیادوں پر استوار ہو تو جنگ ایک مقدس جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بعض افراد کے لیے ایسی جنگ جہاد اور بعض کے لیے صلیبی جنگ قرار پاتی ہے۔ اس طرزِ فکر کی ایک مثال اسامہ بن لادن اور جورج بش کی جنگ تھی جس میں لاکھوں افراد اپنے رہنماؤں کے مذہبی اور سیاسی نظریات وعقاید کی اندھی تقلید کی وجہ سے تشدد کا نشانہ بنے۔ جنگ کا یہ سلسلہ نسل در نسل جاری رہ سکتا ہے جسے روکنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

اختتامی رائے

جب ہم انسانی تکالیف ومصائب کے متذکرہ بالا سات اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس امر سے آگاہ ہوتے ہیں کہ کچھ اسباب انسانوں کی کثیر تعداد پر اور کچھ قلیل تعداد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جیسے طبقاتی مسئلہ دنیا کی 80 فیصد آبادی پر اثر انداز ہوسکتا ہے صنف کا مسئلہ 50 فیصد اور جنسی ترجیح کا مسئلہ 10 فیصد افراد کو متاثر کرسکتا ہے۔ کچھ افراد دوسروں کی نسبت زیادہ متاثر ہوسکتے ہیں کیونکہ ان کے مسائل کے اسباب ایک سے زیادہ ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سیاہ فام ہم جنس پرست مزدور عورت کی جدوجہد چار محاذوں پر ہوگی اور اسے ایک سے زیادہ مسائل کا سامنا کرنا ہوگا۔

ہم انسانی حقوق کی تنظیموں کا جب عالمی سطح پر مشاہدہ کرتے ہیں تو اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں کہ کچھ لوگ ایک گروہ کے حقوق کے تحفظ کا علم بلند کرتے ہیں جبکہ باقی گروہوں کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ نوعِ انسانی صدیوں سے آلام ومصائب کا شکار ہے۔ اب ہم جدید علوم کی وجہ سے، جن میں سائنس، طب، نفسیات اور معاشیات شامل ہیں، بہت سے مسائل کرسکتے ہیں لیکن اس تبدیلی کے لیے ہمیں ایسے ذمہ دار لوگوں اور مقامی اور بین الاقوامی تنظیموں کی ضرورت ہے جو کسی آدرش، اعلیٰ نصب العین اور امن اور سماجی انصاف پر یقین رکھتی ہوں اور اپنے نظریاتی اور سیاسی اختلافات سے بالاتر ہوکر مل کر کام کریں اور انسانیت کے لیے ایک بہتر مستقبل کی تشکیل کریں۔ نوعِ انسانی ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اجتماعی خودکشی کی بجائے ارتقا کی اگلی منزل اس کا پڑاؤ ہوگی اور کرۂ ارض پر ایک سیکولر، انسان دوست اور پرامن دنیا قائم ہوگی۔

سیکولر اخلاقیات اور سات انسان دوست مفکرین

تخلیق: خالد سہیل، ترجمہ: منصور حسین

گزشتہ ماہ ٹورنٹو ہیومنسٹ ایسوسی ایشن [Toronto Humanist Association] میں میرے لیکچر کے بعد ایک مذہبی خاتون نے مجھ سے یہ سوال پوچھا کہ "اگر آپ خدا پر، نبیوں پر، مذاہب پر، وحی پر، گناہ وثواب کے تصور اور قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتے تو آپ اور دیگر آزاد خیال منکرینِ خدا ومذہب رہنمائی کہاں سے حاصل کرتے ہیں؟ آپ کی ہدایت کا سرچشمہ کیا ہے؟"

جب بھی اہلِ دین وایمان' خواہ وہ مسلمان ہوں، عیسائی ہوں یا یہودی' مجھ سے یہ سوال پوچھتے ہیں تو میرا موقف یہی ہوتا ہے۔

کہ صدیوں کے سفر کے بعد انسان ارتقا کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں نفسِ انسانی میں ایک ذاتی ضمیر اور سماجی شعور پیدا ہوچکا ہے۔ اس ضمیر اور شعور کی تشکیل کے بعد انسان کو آفاقی رشد وہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ انسانی تاریخ کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہر صدی اور ہر معاشرے میں ایسے مفکر پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے انسان دوستی کے فلسفہ کا درس دیا ہے۔ اس فلسفے کی بنیاد انسانی تجربات سے حاصل کی ہوئی تعلیمات پر مبنی ہے اور یہی شعور ذات ہماری ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

اکیسویں صدی کا انسان آزاد وخودمختار ہے۔ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ میں جنم لینے والی ان دینی روایات کی پیروی کرے جو حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد ﷺ نے ہدایاتِ ربانی اور مقدس صحیفوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچائیں اور یا وہ ان سیکولر اخلاقیات اور فلسفہ کی پیروی کرے جو سیکولر ماہرینِ نفسیات اور انسان دوست مفکروں نے

چین، بھارت، یونان، یورپ اور شمالی امریکہ میں مروج کیں۔ سیکولر اور ہیومنیسٹ مفکروں کی فہرست بہت طویل ہے، میں اس مضمون میں دنیا کے مختلف خطوں سے صرف سات ہیومنیسٹ مفکروں کی اخلاقی تعلیمات پر توجہ مرکوز کروں گا۔

1- کنفیوشس CONFUCIUS

جب ہم جدید انسانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کنفیوشس پہلا ہیومنسٹ مفکر تھا جو 551 قبل مسیح سے 479 قبل مسیح میں چین میں رہا۔ وہ پہلا مفکر تھا جس نے ہمیں سیکولر فلسفے "ایک دوسرے کی رائے کا احترام کے بنیادی اصول سے روشناس کرایا۔"

اس اصول کو ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو جو اپنے ساتھ کرنا پسند نہ کرتے ہو۔ اس اصول کو سنہری اصول Golden Rule بھی کہتے ہیں۔
کنفیوشس کو ہیومنیسٹ فلسفہ کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے یہ اصول بھی پیش کیا ہے کہ صحیح بات صحیح وجوہات کی بنا پر کرنی چاہیے۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان فطری طور پر نیک سرشت ہے اور ہمیں اس کا احترام کرنا چاہیے۔

ہمیں انسان کو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دینی چاہیے۔ یہ نہیں کہ اسے گنہگار اور بدسرشت کہہ کر بزور و جبر اس کی زندگی پر پابندیاں عائد کریں۔ کنفیوشس کا اپنے معاشرے میں اتنا احترام کیا جاتا تھا کہ اس کو وزیرِ انصاف کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔ اپنے دورِ وزارت میں اس نے معاشرے میں بے شمار اصلاحات نافذ کیں۔ وہ حکمرانوں کو ہمیشہ یہ مشورہ دیتا تھا کہ خود ان اخلاقی اصولوں پر عمل کرو جن پر عوام سے عمل کروانا چاہتے ہوں۔

2- بدھا BUDDHA

دوسرا سیکولر فلسفی بدھا تھا جو 563 قبل مسیح سے 483 قبل مسیح میں ہندوستان میں رہا۔ اس کو سدھارتھ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ذاتی ریاضت سے جب وہ عرفانِ ذات کی منزل تک پہنچا تو اس کو بدھا کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس نے اپنے عہد کے مذہبی عقائد اور توہمات پر سوالات اٹھائے اور اخلاقی قوانین اور روایات کو چیلنج کیا۔ اس نے لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ انہیں اپنے دل، اپنے ضمیر اور اپنی عقل و فہم پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اس کا کہنا ہے کسی بات پر اس لیے

انسانی شعور کا ارتقا

یقین مت کرو کہ وہ بات کسی بزرگ نے کہی ہے۔
کوئی عقیدہ اس لیے مت اپناؤ کہ سب لوگ اسے مانتے ہیں۔
کسی بات پر اس لیے یقین مت کرو کہ اس کا ذکر قدیم صحیفوں میں آیا ہے۔
کسی بات پر اس لیے یقین مت کرو کہ یہ بیان غیب سے آیا ہے۔
کسی بات پر اس لیے یقین مت کرو کہ سب اس پر یقین کرتے ہیں۔
صرف اس بات کا یقین کرو جسے تمہاری ذات نے جانچا اور پرکھا ہو۔
بدھا کا خیال ہے کہ انسان کا اپنا تجربہ اسکا بہترین استاد ہے۔
بدھا کی خواہش تھی کہ لوگ ایک صحت مند، خوش و خرم، اور پر امن زندگی گزاریں اور اپنی سوچ، اپنے جذبات، اور اپنے اعمال کی رہنمائی اپنے ضمیر سے حاصل کریں۔

3- ہپوکریٹیس HIPPOCROTES

ہپوکریٹیس تیسرا ہیومنیسٹ فلسفی تھا اس کو سیکولر طب کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ وہ 410 قبل مسیح میں یونان کے جزیرے کوس پر پیدا ہوا اور تقریباً 100 سال تک زندہ رہا۔ وہ پہلا مفکر تھا جس نے طب کو مذہب سے جدا کیا اور اس بات پر توجہ مرکوز کی کہ انسان کی جسمانی اور ذہنی بیماریوں کی وجوہات انسان کی اپنی ذات میں پوشیدہ ہیں۔ ہپوکریٹیس نے دیکھا کہ جب لوگ بیمار ہوتے تھے تو یہ تصور کیا جاتا تھا کہ خدا ان لوگوں کو عذاب میں مبتلا کر رہا ہے اس لیے کہ انہوں نے گناہ کیے ہیں۔ بیماریوں کو دور کرنے کے لیے لوگ دیوتاؤں کے سامنے قربانیاں پیش کرتے تھے۔ کچھ لوگ یہ تصور کرتے تھے کہ مریض پر جن اور بدروحوں کا اثر یا سایہ ہے۔ ہپوکریٹیس نے گناہ اور جرم و سزا کے مذہبی عقاید پر سوالات اٹھائے اور توہمات کو چیلنج کیا۔ اس نے اپنے مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر بیماریوں کی طبی اور سیکولر وجوہات پیش کیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ انسانی بیماریاں ناقص غذا، ورزش کی کمی، نیند کی کمی اور غیر صحتمند طرز زندگی سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اپنے مریضوں کو مشورہ دیتا تھا کہ دعاؤں اور قربانیوں کی بجائے متوازن غذا کھائیں، باقاعدگی سے ورزش کریں، نیند پوری کریں اور اپنے معیار زندگی کو بہتر بنائیں۔ اس کا کہنا تھا کہ صحت کا راز دعاؤں اور قربانیوں میں نہیں بلکہ ایک صحت مند طرز زندگی میں پنہاں ہے۔

ہپو کریٹیس نے ڈاکٹروں کے لیے ایک حلف بھی تجویز کیا تھا جسے ہپو کریٹیس کا حلف Hippocratic oath کہتے ہیں۔ اس نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اگر ڈاکٹر اپنے مریض کی مدد نہیں کر سکتے تو کم از کم ان کو اتنی احتیاط تو ضرور کرنی چاہیے کہ ان کے مریض کو تکلیف نہ ہو۔ خود اپنے کلینک میں بھی ہپو کریٹیس ایسے نسخے استعمال نہیں کرتا تھا جن کی افادیت پر اسے یقین نہیں ہوتا تھا۔ صدیوں سے ہپو کریٹیس کا حلف ڈاکٹروں، میڈیکل کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لیے مشعل راہ بنا ہوا ہے۔ یہ حلف ڈاکٹروں کو ہمیشہ یہ یاددہانی کراتا ہے کہ ہر مریض کا علاج سیکولر اخلاقیات کی بنیاد پر کرنا ان کا فرض ہے۔

4- سقراط SOCRATES

چوتھا ہیومنیسٹ فلسفی سقراط 469 قبل مسیح سے 399 قبل مسیح میں گزرا۔ اس کے بہت سے طالب علموں میں سے ایک طالب علم افلاطون تھا۔ افلاطون نے اپنی تصنیف ''سقراتی مکالمے'' Socratic Dialogues میں وہ سارا علم و دانش اور حکمت بیان کیا ہے جو اس نے سقراط سے سیکھا تھا۔ سقراط نے اپنے عہد کے معاشرے، اس کی روایات اور رسومات کو مستقل چیلنج کیا اور اپنے نوجوان شاگردوں کے ساتھ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لگاتار بحث اور مباحثے میں مصروف رہا۔ لوگ ہمیشہ اس پر تنقید کرتے رہے، اس پر مقدمہ چلایا گیا اور بالآخر اس پر مندرجہ ذیل دو جرائم کا الزام عائد کیا گیا۔

1- وہ نئی نسل کے نوجوانوں کو اپنے سیکولر فلسفہ سے بہکا رہا تھا۔
2- وہ یونانی دیوتاؤں کو نہیں مانتا تھا۔

اس جرم کی پاداش میں اسے زہر پی کر مرنے کی سزا دی گئی جو اس نے بخوشی قبول کر لی کیوں کہ اسے اپنے موقف کی سچائی اور اپنے ضمیر کی آواز پر پورا یقین تھا۔

سقراط نے عاقلانہ، منطقی اور تجزیاتی سوچ کو فروغ دیا اور اپنے طالب علموں کو ہمیشہ یہ درس دیتا رہا کہ مذہبی تعلیمات، تصورات، اور توہمات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں ان کی اندھا دھند تقلید نہ کریں۔ سقراط کا موقف تھا کہ وہ زندگی جینے کے لائق نہیں جسے انسان نے عقل کی کسوٹی پر پرکھا اور سمجھا نہ ہو۔ اسکا کہنا تھا کہ انسان حقیقت اور سچائی کو باہمی مکالمہ سے دریافت کر سکتا ہے۔ سقراط ایک ایماندارانہ، مخلص اور اخلاقی زندگی گزارنے پر یقین رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی

موت کے وقت بھی اس نے اپنے طلبا کو یاددہانی کرائی تھی کہ وہ اس کا قرض ادا کرنا نہ بھولیں۔

سقراط نے حقیقت اور سچائی کی تلاش اور تحقیق کے لیے ایک طریقہ کار وضع کیا جس کو سقراطی طریقہ Socratic Method کہتے ہیں۔ سقراط نے یہ سکھایا کہ انسان حقیقت اور سچائی اپنی ذاتی اور معاشرتی زندگی کے مطالعے اور مشاہدے سے تلاش کر سکتا ہے اسے آسمانی کتابوں پر انحصار کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طریقہ فکر کی بنیاد پر انسان ایسے سیکولر قوانین بنا سکتا ہے جس سے حکومت کا نظام چلایا جا سکے۔ یہ طریقہ فکر مغربی سائنس اور فلسفہ میں بنیادی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ مغرب میں سچ اور انصاف جیسی بنیادی اقدار اسی سقراطی طریقہ فکر پر منحصر ہیں۔ سقراط کو مغربی سیکولر فلسفے کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

5- سگمنڈ فرائڈ SIGMUND FREUD

پانچواں ہیومنسٹ فلسفی سگمنڈ فرائیڈ ہے، جو 1856 سے 1939 میں یورپ میں رہا۔ اسے انسانی نفسیات میں گہری دلچسپی تھی۔ فرائڈ نے تحلیل نفسی (سائیکو انالیسس Psychoanalysis) کے ذریعے ذہنی امراض کی تشخیص اور علاج کے طریقہ کار کی بنیاد رکھی۔ اس نے خواب، مزاج اور غیر معمولی عادات و اطوار کا تجزیہ کر کے انسان کے لاشعور کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے تجزیہ سے یہ واضح کیا کہ بچپن میں سیکھے ہوئے مذہبی عقائد انسان کے سوپر ایگو Super-ego کو سخت اور ضدی بنا دیتے ہیں اور یہ کیفیت بہت سے انسانی مسائل اور تکالیف کا سبب بنتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ بجائے اس کے کہ لوگ ذہنی مسائل کو مذہبی تعلیمات اور مذہبی اخلاقیات کے نظریہ سے جانچیں ان کا تجزیہ ذہنی بیماری کے طور پر کرنا چاہیے۔ اس نے ذہنی کارکردگی کا ایک نظام تجویز کیا جو ڈیفنس اور کوپنگ میکینزم Defence and Coping mechanisms پر مبنی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ صحتمند افراد زندگی کے مسائل سے نمٹنے کے لیے صحتمند ڈیفنس اور کوپنگ میکینزم استعمال کرتے ہیں [مثلاً مزاح یا سبلیمیشن Sublimation] جبکہ ذہنی مریض غیر صحتمند ڈیفنس اور کوپنگ میکینزم استعمال کرتے ہیں [مثلاً انکار Denial]۔ اپنی تحقیق کے دوران اس نے یہ مشاہدہ بھی کیا کہ نفسیاتی مسائل کا شکار افراد اکثر اپنی بے ربط جذباتی کیفیات کی ذہنی توجیہات تلاش کرتے رہتے ہیں جسے اس نے ریشنلائزیشن Rationalization کا ڈیفنس میکینزم قرار دیا۔ اس

نے اپنے مریضوں کو انکے جذباتی مسائل اور تضادات کو حل کرنے کا طریقہ سکھایا اور یہ بتایا کہ صحتمند ڈیفنس اور کوپینگ میکنیز م استعمال کر کے وہ کس طرح ایک پرسکون اور خوش وخرم زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

بجائے مذہبی عقاید و اخلاقیات کے فرائیڈ نے ایک سیکولر اور سائنسی نقطۂ نظر کو فروغ دیا۔ اسے پختہ یقین تھا جوں جوں سائنس کی سرحدیں وسیع ہونگی مذہب کی سرحدیں سکڑتی چلی جائینگی۔

6- وکٹر فرینکل VICTOR FRANKL

چھٹا ہیومنسٹ فلسفی وکٹر فرینکل ہے۔ وہ ایک یورپین سائیکوانالیسٹ تھا جو 1905ء سے 1997ء میں گزرا۔ وکٹر فرینکل کی کتاب ''انسان کی معنی کی تلاش'' Man's Search for meaning اس کے اپنے ان تجربات پر مبنی ہے جو اس کو نازی جرمنی کے ہولوکاسٹ کیمپ میں پیش آئے۔ اس کتاب کا بیس سے زائد زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ وکٹر فرینکل سیکولر اخلاقیات کا پرجوش حامی تھا۔ اس نے لوگوتھراپی Logotherapy کے نام سے ذہنی علاج کا ایک طریقہ تجویز کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان اپنی زندگی کے مسائل اور مصائب سے بہتر طور پر نمٹ سکتا ہے اگر وہ ان میں کوئی معنی تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اس نے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ اپنی زندگی میں خود معنی تلاش کریں۔

7- ابراہم ماسلو ABRAHAM MASLOW

ساتواں ہیومنسٹ فلسفی ابراہم ماسلو ہے، وہ ایک امریکی ماہر نفسیات تھا جو 1908ء سے 1970ء میں گزرا۔ اس کی کتاب ''موٹیویشن اینڈ پرسنالیٹی'' Motivation and personality نے بہت مقبولیت پائی۔ اس کتاب میں اس نے نفس انسانی کی بنیادی ضروریات کی نشاندہی کی ہے اور پھر ان ضروریات کو مختلف درجات hierarchy میں ترتیب دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے بھوک اور پیاس انسانی ضروریات کا سب سے نچلا درجہ ہے اور ہر انسان زندگی کے اس درجے سے گزرتا ہے۔ بھوک اور پیاس سے اوپر تحفظ ذات اور عزت نفس کا درجہ ہے۔ ذہنی نشوونما اور ارتقائے ذات نفس انسانی کی سب سے اعلیٰ ضرورت ہے۔ یہ وہ درجہ ہے، جس پر پہنچنے والے لوگ self actualized people عرفان ذات

کے متلاشی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی ذات کی گہرائیوں میں اتر کر اپنا تخلیقی جوہر تلاش کرتے ہیں اور دنیا کے سامنے شاعر، فلسفی، فنکار، صوفی، مصلح اور انقلابی بنکر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے معاشرے اور اپنے عوام کو انسانی ارتقا کے سفر میں آگے بڑھاتے ہیں۔

ماسلو کو مذہب اور روحانی تجربات میں بھی گہری دلچسپی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ روحانی تجربات انسان کی اپنی ذات سے وجود میں آتے ہیں اور اس کے لیے خدا یا مذہب پر ایمان ضروری نہیں۔ روحانی تجربات کو اس نے ''پیک ایکسپیرینس Peak Experiences'' کا نام دیا ہے۔ ایک ماہر نفسیات کے حیثیت سے اس نے روحانی تجربات کی ایسی توجیہات پیش کی ہیں جن پر مذہبی اور غیر مذہبی لوگوں نے یکساں اتفاق کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا روحانی تجربہ انسانی وجود کا حصہ ہے کسی الوہی وجود کا حصہ نہیں۔

صدیوں سے سیکولر فلسفی اور ہیومنیسٹ ماہر نفسیات سیکولر اخلاقیات اور ہیومنیسٹ فلسفہ کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ اکیسویں صدی کے لوگوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ آسمانی مذاہب کی روایات پر عمل کریں یا جدید سائنس، نفسیات، طب اور فلسفہ کی سیکولر روایات کو اپنائیں۔ گزشتہ چند صدیوں میں سیکولر روایات کو ماننے والے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ میں دنیا میں 1900ء آزاد خیال اور غیر مذہبی انسان دوست لوگوں کی تعداد ایک فیصد تھی۔ 2000ء میں یہ تعداد بڑھتے بڑھتے 15 فیصد ہوگئی ہے۔ کینیڈا میں یہ تعداد 19 فیصد ہے جبکہ سکینڈی نیوین ممالک میں یہ تعداد 50 فیصد سے زیادہ ہے۔

سیکولر ہیومنیزم اور انسان دوستی کی ایک بڑی کامیابی یہ ہے کہ بہت سے ممالک میں مذہبی قوانین کو تبدیل کر کے ان کی جگہ سیکولر قوانین نافذ کئے جا رہے ہیں۔ گناہ sin کے تصور کی بجائے جرم crime کا تصور رائج ہو رہا ہے۔ سیکولر ممالک میں ارتکاب جرم پر ملزم کو مذہبی قوانین کے تحت جہنم رسید نہیں کیا جاتا بلکہ ایک غیر جانب دار نظام عدل و انصاف کے تحت مجرم کا احتساب کیا جاتا ہے، جس کے بعد رحم اور ہمدردی کے ساتھ ماہرینِ نفسیات مجرم کی اصلاح reform کے لئے ایک لائحہ عمل مرتب کرتے ہیں۔ تاکہ اصلاح کے بعد ایسے لوگ بھی ایک فعال اور کامیاب زندگی بسر کر سکیں۔

سیکولر نظریات کے حامل افراد سیکولر اور ہیومنیسٹ ریاستوں کی داغ بیل ڈال رہے ہیں

جہاں تمام شہریوں کو مساوی حقوق اور مراعات حاصل ہونگی، خاص طور پر خواتین اور اقلیتوں کو وہی آزادی حاصل ہوگی جو عام شہریوں کو ملتی ہو۔ 1948 میں اقوام متحدہ کا ''انسانی حقوق کا بین الاقوامی اعلامیہ'' United Nations Declaration of International Human Rights سیکولر اخلاقیات اور قوانین کو رائج کرنے میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا ہے۔

بہت سے مذہبی ممالک میں آہستہ آہستہ سیکولر ہیومنیسٹ تبدیلیاں آرہی ہیں۔ جس کے تحت لوگ اپنے ذاتی، سماجی اور سیاسی زندگی میں سیکولر اخلاقیات کی پیروی کرنے کی آزادی حاصل کرتے جارہے ہیں۔

امن کے معمار

تخلیق: خالد سہیل، ترجمہ: عبدالغفور چودھری

ہر معاشرے اور کلچر میں کچھ لوگ لڑاکا اور جھگڑالو ہوتے ہیں جو تشدد پھیلاتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو امن' دوستی اور باہمی ہم آہنگی کا پرچار کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنے خاندانوں' اسکولوں' دیہاتوں اور شہروں میں اور کچھ قومی اور بین الاقوامی سطح پر امن کی فضا پیدا کرتے ہیں۔

کرہ ارض پر امن کی فضا پیدا کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ان تمام عناصر کو کم کریں جو تشدد' جھگڑے اور لڑائی کا سبب بنتے ہیں اور ان تمام عناصر کو بڑھاوا دیں جو جھگڑوں کو پرامن طریقے سے حل کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جس طرح صحت صرف بیماری کے ختم ہونے کا نام نہیں اسی طرح قومی اور بین الاقوامی سطح پر امن قائم کرنے کے لیے صرف جنگ کا خاتمہ ہی کافی نہیں اس کے لیے محبت اور آشتی کی فضا قائم کرنا بھی ضروری ہے۔

میں پچھلے چند سالوں سے نوبل امن لیکچرز Nobel Peace Lectures کا مطالعہ کر رہا ہوں تا کہ امن کے محرکات کو بہتر طریقے سے سمجھ سکوں۔ اس مطالعہ کے دوران مجھے شدت سے احساس ہوا کہ امن ایک قوس قزح ہے جس کے بہت سے رنگ ہیں اور ہر رنگ اہم ہے۔ اس مضمون میں میں صرف چند رنگوں کا ذکر کروں گا۔

اقتصادی امن ECONOMIC PEACE

وہ معاشرے اور ممالک جہاں امیروں اور غریبوں کے درمیان اقتصادی بعد پایا جاتا ہے

وہاں امیروں اور غریبوں میں تشدد اور پھوٹ پڑنے کا امکان غالب ہوتا ہے۔ جب کچھ لوگ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور ان کے بچے بھوکے سوتے ہیں اور ان کے ہمسائے محلوں میں رہتے ہیں تو دولت اور وسائل کی غیر مساوی تقسیم ان میں غصے کا موجب بنتی ہے۔ جب لوگ زندگی کی بنیادی ضروریات: خوراک، رہائش، تعلیم، صحت اور ملازمت سے محروم رہیں تو وہ امید، عزتِ نفس اور وقار کھونا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے ذہنی انتشار میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو ان کو مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتا ہے اور وہ ایسے غیر منصفانہ نظام کو تباہ کرنے پر تل جاتے ہیں جس نے ان کی ضرورتوں کو پورا نہیں کیا۔ وہ ایسا نظام چاہتے ہیں جو ان کو سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف و امن دے سکے۔ بہت سے اشتراکی ماہرینِ اقتصادیات و عمرانیات کا خیال ہے کہ امن کا اقتصادی حالات سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دنیا کو پرامن بنانے کے لیے ہمیں غربت سے لڑنا ہوگا۔ بنگلہ دیش کے ڈاکٹر محمد یونس ان دانشوروں میں سے ہیں جو غربت اور بھوک کے خلاف برسوں سے برسرِ پیکار ہیں اور کامیابی نے ان کے قدم چومے ہیں۔ اسی لیے انہیں 2006ء میں امن کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔ اپنے خطبہ امن میں انہوں نے بتایا کہ یونیورسٹیوں کے علمی ایوانوں میں مختلف اقتصادی نظریوں پر بحث و تمحیص کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ غربت کے خلاف جنگ لیکچر ہالز کی بجائے گلیوں، بازاروں اور جھونپڑیوں میں لڑنا ہوگی۔ انہوں نے دیہاتی سطح پر گرامین بینک Grameen Bank بنانے شروع کیے اور عورتوں کے لیے چھوٹے چھوٹے قرضوں کا اجرا کیا۔ جوں جوں بینک ترقی کرتے گئے زیادہ سے زیادہ تعداد میں عورتوں نے قرضے لے کر اپنا معیارِ زندگی بلند کرنا شروع کیا۔ نوبل انعام حاصل کرنے تک تہتر ہزار دیہاتوں سے ستر لاکھ عورتوں نے قرضے حاصل کر کے بینک سے استفادہ کیا تھا۔ ڈاکٹر یونس کو اس بات پر پورا یقین ہے کہ غربت امن کے لیے خطرہ ہے اور افلاس کے خلاف جہاد پرامن طرزِ زندگی اور پرامن معاشروں اور ملکوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر یونس نے بہت سارے بھکاریوں کو بھی کاروبار شروع کرنے میں مدد کی تا کہ وہ باعزت اور پر مقصد زندگی بسر کر سکیں۔

ڈاکٹر یونس کا خیال ہے کہ بین الاقوامیت ایک ملی جلی برکت ہے۔ ایک سطح پر یہ دنیا کے مختلف خطوں کے رابطے کا باعث بنتی ہے لیکن دوسری رخ پر یہ بین الاقوامی کمپنیوں کو ترقی اور

خوشحالی کی طرف گامزن کرتی ہے جس کے نتیجے میں چھوٹی کمپنیوں اور کاروباروں کے لیے پھلنا، پھولنا اور پنپنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر یونس بین الاقوامیت کو ایک ایسی بین الاقوامی شاہراہ سے تشبیہ دیتے ہیں جس کی ایک سو لینز one hundred lanes ہوں۔ اس شاہراہ پر بڑے بڑے ٹرک تو چل سکتے ہیں لیکن چھوٹے چھوٹے رکشے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیے جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اقتصادی ترقی کا سماجی ترقی سے چولی دامن کا ساتھ ہونا چاہیے تا کہ جب بڑی کمپنیاں اور کاروبار ترقی کریں تو انہیں اپنی دولت اور منافع میں غربا کو شریک کر کے کامیابی سے ہم کنار کرنے میں ان کی مدد کریں۔ ایسا کرنے سے امرا اور غربا کے درمیان فاصلہ کم ہوگا اور ہم ایک متوازن اور پرامن دنیا قائم کر سکیں گے۔

ڈاکٹر یونس کا کہنا ہے کہ غربت غریب لوگ پیدا نہیں کرتے۔ یہ امیر لوگوں کی پالیسیوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو اکثریت کی بجائے اقلیت کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں گرامین بینک Grameen Bank کا موڈل بہت سارے غریب اور ترقی پذیر ممالک نے اپنایا ہے۔

سماجی امن Social Peace

اقتصادی امن کے ساتھ ساتھ ہمیں سماجی امن کی بھی ضرورت ہے۔ پرامن فضا پیدا کرنے کے لیے مختلف نسلی، مذہبی اور کلچرل پس منظر کے لوگوں کو مل جل کر رہنے اور پرامن طریقوں سے اپنے جھگڑے حل کرنے کا طریق کار اپنانا ہوگا۔ ایسی فضا اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ملک کے قوانین ایسے ہوں جو انسانی حقوق Human Rights کو اہمیت اور وقعت دیں، لوگوں میں سماجی شعور بیدار ہو چکا ہو اور وہ قبائلی سوچ اور ذہنیت Tribal Mentality کو ترک کر چکے ہوں۔

بیسویں صدی میں مارٹن لوتھر کنگ جونیئر Martin Luther King Junior ایک ایسے لیڈر تھے جنہوں نے سماجی امن کی جنگ لڑی اور انہیں 1964ء کا امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ یہ انعام انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کا انعام تھا۔ اس جدوجہد نے امریکہ میں اس وقت نیا موڑ لیا جب ایک بوڑھی کالی عورت روزا پارک Rosa Park نے ایک بس میں اپنی سیٹ ایک گورے نوجوان کو دینے سے انکار کر دیا۔ اس جدوجہد نے اس وقت زور پکڑا

جب سیاہ فام لوگوں نے ہڑتال کی' بسوں کا بائیکاٹ کیا اور اپنے کاموں پر پیدل جانا شروع کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب مارٹن لوتھر کنگ نے اس وقت تک پرجوش تقریریں جاری رکھیں جب تک کہ غیر منصفانہ اور متعصبانہ قانون تبدیل نہیں ہو گیا۔ ان کا ایمان تھا کہ وقار کے ساتھ قربانی دینا علیحدگی کی ذلت سے بہتر ہے۔ اپنے خطبہ امن میں انہوں نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ امریکہ میں سیاہ فام لوگ طویل مدت سے اپنی جلد کے رنگ کی وجہ سے مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ناانصافی دور کی جائے تا کہ سیاہ فام لوگ پروقار اور باعزت زندگی گزار سکیں۔ ان کا ایمان تھا کہ پسے ہوئے لوگ ہمیشہ کے لیے پستے نہیں رہیں گے۔

کنگ ایک پرامن رہنما تھے۔ وہ تشدد کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پرامن مقاصد پرامن طریقوں سے حاصل کیے جائیں۔ ان کی سوچ اس دور کے دوسرے رہنماؤں سے مختلف تھی جو اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کرنے کے حق میں تھے۔ کنگ نے تشدد کی نفسیات کے سلسلے میں اپنا فلسفہ ان الفاظ میں بیان کیا 'نسلی انصاف حاصل کرنے کے لیے تشدد کا طریقہ غیر عملی اور غیر اخلاقی ہے۔ مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ تشدد وقتی طور پر اچھے نتائج برآمد کرتا ہے۔ کئی اقوام نے اپنے آزادی جنگ لڑ کر حاصل کی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عارضی فتوحات کے باوجود تشدد کبھی بھی مستقل امن نہیں لاتا۔ یہ کسی بھی سماجی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اس سے مزید پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ تشدد غیر عملی ہے کیونکہ وہ سب کے لیے تباہی کا باعث بنتا ہے۔ تشدد غیر اخلاقی ہے کیونکہ وہ دشمن سے افہام و تفہیم پیدا کرنے کی بجائے دشمن کو ذلیل و خوار کرتا ہے۔ تشدد کو رام کرنے کی بجائے اس کو ختم کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ تشدد غیر اخلاقی ہے کیونکہ وہ محبت کی بجائے نفرت پر پھولتا پھلتا ہے۔ وہ معاشرے کو تباہ و برباد کرتا ہے اور اخوت کو ناممکن بناتا ہے۔ وہ معاشرے کو ڈائلاگ کی بجائے مونولوگ کی طرف لے جاتا ہے۔ تشدد خود اپنی شکست کا باعث بنتا ہے۔ وہ شکست خوردہ لوگوں میں تلخی پیدا کرتا ہے اور فتحیاب لوگوں میں ظلم۔ کنگ اور ان کے باوقار ساتھی اپنے آدرش کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے پر آمادہ تھے۔ وہ اپنے نصب العین کے لیے جانیں دینے کے لیے تیار تھے لیکن دوسروں کی جانیں لینے کے لیے نہیں۔ کنگ موہن داس گاندھی کے پیروکار تھے جو عدم تشدد کے پیغمبر تھے اور گاندھی لیو ٹولسٹائی کے مقلد تھے جو امن کے پیغمبر تھے۔

انسانی شعور کا ارتقا

ٹولسٹائی' گاندھی اور کنگ کے پیروکاروں نے پرامن طریقوں سے پرامن دنیا بنانے کی کوششیں کیں۔ انہوں نے تمام نسلوں کے لیے مساوی انسانی حقوق کی تائید کی اور امن کے بقا کے لیے پرامن جنگ لڑی۔

انسانی حقوق اور امن Human Rights and Peace

بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے پوری انسانیت کا سماجی شعور ایسی سطح تک آن پہنچا ہے کہ اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کی بین الاقوامی قرارداد منظور کر لی ہے۔ اس قرارداد کے مطابق تمام ممالک اور معاشروں کے تمام انسان' چاہے وہ کسی رنگ' نسل' زبان' مذہب اور جنسی ترجیح سے تعلق رکھتے ہوں' برابر کے حقوق رکھتے ہیں۔ انسانی حقوق کا یہ پیغام امن کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے بہت اہم ہے۔

بدقسمتی سے دنیا کے بہت سے ممالک ابھی تک امن اور انسانی حقوق کے اس خواب کو شرمندہ تعبیر نہیں کر پائے لیکن اس کی کوششیں جاری ہیں۔ انسانی حقوق کا یہ آئین بہت سے لوگوں کے لیے رہنمائی مہیا کر رہا ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں سینکڑوں' لاکھوں' کروڑوں لوگ آج بھی انسانی حقوق کی محرومی کی اذیت سے گزر رہے ہیں لیکن انسانی حقوق کے علمبردار ان کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان مجاہدوں میں سے ایک شیریں عبادی ہیں۔ وہ پہلی مسلمان خاتون ہیں جنہیں 2003ء میں امن کا نوبل انعام ملا۔ انہوں نے اپنے نوبل لیکچر میں فرمایا "بدقسمتی سے اس سال کی اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کی رپورٹ پچھلے سالوں کی طرح ایک تباہی کی نشاندہی کرتی ہے۔ جو پوری انسانیت کو انسانی حقوق کے بین الاقوامی منشور سے دور لے جاتی ہے۔ 2002ء میں تقریباً 102 ارب لوگ غربت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کی آمدنی ایک ڈالر روزانہ سے بھی کم تھی۔ بنگلہ دیش کے ڈاکٹر یونس کی طرح ایران کی شیریں عبادی بھی شدت سے یہ محسوس کرتی ہیں کہ غربت انسانی حقوق اور عالمی امن کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔"

شیریں عبادی اس بات سے فکرمند ہیں کہ تیسری دنیا کے غریب ممالک کے لاکھوں کروڑوں لوگ اذیت میں مبتلا ہیں اور پہلی دنیا کے امیر اور خوشحال لوگ ان غریبوں کی ضروریات سے بے خبر اور ان کے مسائل کے بارے میں بے حس ہیں۔ وہ ایسی پالیسیاں

بناتے ہیں جو دوسروں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیتی ہیں۔ پہلی دنیا کی حکومتیں تیسری دنیا کے لوگوں کے انسانی حقوق کو کوئی اہمیت نہیں دیتیں۔ اس کی ایک مثال دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پکڑے ہوئے لاتعداد قیدی ہیں جو جنیوا کی قرارداد کے مطابق انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ اس حقیقت سے صاف ظاہر ہے کہ امریکی حکومت خود ان اصولوں پر عمل نہیں کرتی جس کا ساری دنیا میں پرچار کرتی ہے۔

برطانوی ڈرامہ نگار ہیرالڈ پنٹر Harold Pinter جن کو ادب کا نوبل انعام ملا تھا اپنے لیکچر میں پوری دنیا کو ان الفاظ میں چیلنج کرتے ہیں 'ہماری اخلاقی اقدار کو کیا ہو گیا ہے؟' کیا ہمیں احساس ہے کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟ کیا ہم بے ضمیر ہو چکے ہیں؟ ہم اس ضمیر کا ذکر کیوں نہیں کرتے جس کا تعلق نہ صرف ہمارے اعمال سے ہے بلکہ اس کا تعلق مجموعی ذمہ داری اور دوسروں کے اعمال سے بھی ہے۔ گوٹینامابے Gutanama Bay کو دیکھیں جہاں سینکڑوں لوگ بغیر کسی جرم کے ثبوت کے تین سال سے قید ہیں۔ اس مدت میں انہیں کوئی قانونی معاونت نہیں دی گئی۔ یہ قید جینوا کنونشن کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ کیا بات ہے کہ اس ظلم کا بین الاقوامی سطح پر کوئی ذکر نہیں ہوتا؟

ہیرالڈ پنٹر نے امریکی خارجہ پالیسی پر سخت نقطہ چینی کی جو نہ صرف انسانی حقوق پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ عالمی امن کے لیے بھی خطرہ ہے۔ وہ پچھلی چند دہائیوں میں امریکہ کے دوسرے ممالک سے روابط اور اس کے کردار پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسی بھی آزاد ملک پر براہِ راست حملہ امریکہ کا پسندیدہ طریقہ نہیں ہے۔ عموماً وہ کم تشدد والا طریقہ اپناتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہزاروں لوگ آہستہ آہستہ موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں۔ ایک دم سے ان پر بم نہیں پھینکے جاتے۔ وہ ملک کے دل کو روگ لگا دیتے ہیں اور پھر زخم کو بڑھتا اور پھیلتا دیکھتے ہیں۔ جب ملک کے عوام ہتھیار ڈال رہے ہوتے ہیں یا موت کے گھاٹ اتر رہے ہوتے ہیں تو اس دوران ملٹری اور بڑی کارپوریشنز آرام و سکون سے یہ سب دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ تب وہ ٹی وی کے کیمروں کے سامنے جاتے ہیں اور کہتے ہیں 'جمہوریت جیت گئی ہے'۔ یہ امریکہ خارجی پالیسی کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

سیاسی امن۔ POLITICAL PEACE

پچھلی چند صدیوں کے دوران متعدد قومیں اور قبائل ایک دوسرے سے دست و گریبان رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے بچوں کو نسل در نسل مار رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں متعدد سیاسی لیڈروں نے اپنے پیروکاروں کی توجہ اس طرف دلوائی کہ وہ جنگیں جاری رکھ سکتے ہیں اور مزید انسانی جانیں ضائع کر سکتے ہیں اور یا اپنے دشمنوں سے صلح کر کے تشدد کا یہ دور ختم کر سکتے ہیں۔ میں اس کی دو مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی مثال اسرائیلی لیڈر یٹزک ربین Yitzak Rabin کی ہے جنہوں نے فلسطینی لیڈر یاسر عرفات سے ہاتھ ملایا اور دونوں نے 1994ء میں امن کو نوبل انعام حاصل کیا۔ یہ انعامات مشرقِ وسطیٰ میں دونوں کی امن کی کوششوں کے سلسلے میں دیے گئے تھے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ دونوں لیڈر امن کے راستے پر چلنے سے پہلے مسلح جدوجہد armed struggle میں شامل تھے۔ یاسر عرفات نے اپنے نوبل لیکچر میں فرمایا کہ امن کے معاہدے کی بنیاد یہ تھی کہ فلسطینیوں کو نہ صرف امن کے بدلے میں زمین ملے گی بلکہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کی وجہ سے فلسطینیوں کو ان کے جائز حقوق بھی ملیں گے۔ یٹزک ربین نے اپنے خطبہ امن میں یاسر عرفات اور ان کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے امن کے راستے کا انتخاب کیا۔

ربین اور عرفات نے مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس سے پیشتر کہ ربین اور عرفات امن کی عمارت تعمیر کر سکتے ایک انتہا پسند اور تشدد پسند یہودی نے ربین کو اس لیے قتل کر دیا کہ اس نے دشمن سے ہاتھ ملایا تھا۔ ربین کو امن کی خاطر اپنی جان کی قربانی دینی پڑی۔

امن کے معاہدے کی دوسری مثال مینڈیلا اور ڈی کلارک کا معاہدہ تھا جو ربین اور عرفات کے معاہدے سے زیادہ کامیاب رہا جس کے نتیجے میں جنوبی افریقہ میں جمہوری انتخابات ہوئے اور دونوں کو امن کا نوبل انعام ملا۔ اپنے نوبل لیکچرز میں دونوں نے اپنے فلسفہ امن پر روشنی ڈالی۔ منڈیلا نے کہا 'ہم یہ امید کرتے ہیں کہ جنوبی افریقہ ایک نیا روپ دھارے گا اور جمہوری اقدار اپنائے گا۔ وہ ایک ایسا سیاسی نظام قائم کرے گا جس میں انسانی حقوق کی

پاسداری ہوگی۔ہم چاہتے ہیں کہ یہ دنیا غربت اور جہالت سے پاک اور جنگوں کے خوف سے آزاد ہو۔ہمیں اس ڈر سے بھی نجات ملے کہ لاکھوں لوگوں کو مجبوراً مہاجر بننا پڑے گا۔'

ڈی کلارک نے اپنے خطبہِ امن میں کہا کہ انصاف اور باہمی رضامندی کے بغیر امن ممکن نہیں۔انہوں نے فرمایا کہ امن ایک زاویہِ نگاہ ہی نہیں ایک مطمعِ نظر بھی ہے۔امن سوچ کا ایسا انداز ہے جس میں ملک' معاشرے' جماعتیں اور افراد کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے اختلافات تشدد کی بجائے افہام وتفہیم سے حل کریں۔امن ایسا طرزِ زندگی ہے جس میں سماجی' اقتصادی اور سیاسی معاملات کے بارے میں پرامن تبادلہِ خیال کیا جاسکتا ہے۔

جوں جوں دنیا کے زیادہ سے زیادہ رہنما اور ان کے پیروکار امن کا شعور پیدا کریں گے تو وہ تشدد کی بجائے امن کا راستہ اپنائیں گے اور ایک پرامن معاشرہ اور دنیا تعمیر کریں گے۔ اقتصادی' سماجی اور سیاسی امن ایک ہی قوسِ قزح کے مختلف رنگ ہیں جسے پرامن لوگ اپنی کوششوں سے تخلیق کررہے ہیں۔

یہودی دانشور ایلی ویزل کا کہنا ہے کہ امن خدا کا انسانوں کو نہیں بلکہ انسانوں کا ایک دوسرے کو محبت بھرا تحفہ ہے۔

انسانی ارتقاء میں صوفیوں، فنکاروں اور سائنسدانوں کا کردار

تخلیق: خالد سہیل، ترجمہ: عظمیٰ محمود

جب ہم انسانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ انسانی ارتقاء کا عمل صدیوں پر محیط ہے۔ ہر نسل میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی رہی ہے جو اندھا دھند روایتی رسم و رواج کو نہ صرف مانتے ہیں بلکہ ان پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔ایسے رسم و رواج کچھ ایسے مذاہب کو جنم دیتے ہیں جن کے رہنما اپنے پیروکاروں میں بہت اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور وہ عوام الناس کی ذاتی اور معاشرتی زندگی پر حکومت کرتے ہیں۔ان رہنماؤں میں سے کچھ اس طاقت کے نشہ کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اپنی پیروکار اکثریت کو سماجی۔ معاشی اور سیاسی طور پر گمراہ کردیتے ہیں۔ جیسے جیسے یہ مذاہب اور روایات اداراتی صورت اختیار کرتے چلے جاتے ہیں تو انکے اختیارات اور طاقت کا استعمال بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔لیکن ہر نسل میں ایک اقلیت ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو صوفی، فنکار یا سیاستدان ہوتے ہیں۔ایسے لوگ ان مذہبی رہنماؤں اور روایات کے خلاف آواز اٹھانے والے ہوتے ہیں۔

صدیوں سے بہت سی مختلف قوموں اور تہذیبوں میں روحانی لوگ پیدا ہوتے آئے ہیں جو کبھی تو صوفی کہلائے تو کبھی سادھو، کبھی سنت اور کبھی درویش۔ان لوگوں نے صرف اپنے دل کی مانی نہ کہ لگی بندھی تہذیبی روایات کو اپنایا۔ایسے لوگوں کو اصحاب بست و کشاد نے اپنا دشمن سمجھا۔کچھ کو اذیتیں دیں۔

اور کچھ کو تو مار بھی دیا گیا، کیونکہ وہ عام انسان کا درد سمجھنے اور اس کا ساتھ دینے والے تھے۔ بھگت کبیر، بابا بلھے شاہ، شیخ سعدی، مولانا رومی، ولیم بلیک اور والٹ وائٹمن ۔ یہ سب وہ لوگ تھے جنہوں نے مذہبی اور معاشرتی سزاؤں کو نہ صرف بھگتا بلکہ بھاری قیمت بھی ادا کی۔ایک

مشہور صوفی منصور حلاج 'انا الحق' کہنے پر مصلوب ہوئے۔

ان خدا ترس صوفیوں، سادھوؤں اور سنتوں سے وہ روایتی پادری، راہب، مُلا اور پنڈت جو اپنے علاقوں میں مذہبی ٹھیکیدار بنے ہوتے ہیں، بہت خوفزدہ رہتے ہیں۔ عوام الناس نے اپنے اپنے علاقوں کے صوفیاء سے محبت ہی نہیں ان کا احترام بھی بہت کیا کیونکہ ان صوفیاء نے سادگی سے زندگی گزاری اور گناہ وثواب اور جنت دوزخ سے بالاتر ہو کر مخلوقِ خدا کی خدمت کی۔ ان صوفیاء نے روایتی اعتقادات اور صحائف کے مقابل انسان دوستی کی اقدار کے قیام کو ترجیح دی۔ انکے فلسفے کا احاطہ کرنے کے لئے دو صوفیاء کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ایک قدیم صوفی، مہاتما بدھ نے فرمایا کہ:

- اعتقاد مت کرو اس بات پر کہ یہ بات کسی نام نہاد سیانے نے کہی ہے۔
- اعتقاد مت کرو کہ اس کا ذکر ازمنہ قدیم کی کتابوں میں ملتا ہے۔
- اعتقاد مت کرو اس بات پر کہ اس کا تعلق ابتدائے آفرینش سے ہے
- اعتقاد مت کرو محض اس لئے کہ کوئی اور اس پر اعتقاد رکھتا ہے۔

اعتقاد رکھو تو اس پر جسے تم نے ذاتی طور پر جانچا اور پرکھا ہے اور سچائی اور حقیقت پر مبنی ہے۔

بیسویں صدی کے مشہور صوفی جے کرشنا مورتی کہتے ہیں کہ: ''سچائی ایک نارفتہ سرزمین ہے۔''

انسانی تغیر اور نشوونما کے ساتھ ساتھ ایسی تخلیق کار شخصیتیں جنہوں نے روایتی اعتقادات کا مقابلہ کیا عظیم فنکاروں کی صورت میں ابھریں۔ انہوں نے روایتی اخلاقیات کا مقابلہ کرنے کے لئے مصوری، ڈراموں اور شاعری کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اعلیٰ تخیل اور غیر روایتی ادراک سے لبریز ان فنکاروں نے ہمیں یہ سکھایا کہ صحائف علاقائی قصے کہانیاں اور لوک ورثہ ہیں اور ہمیں مقدس کتابوں کی لغوی تشریح کی بجائے استعاراتی رنگ میں وضاحت کرنی چاہیے۔ تخلیق کار عوام الناس سے جذباتی طور پر منسلک ہوتے ہیں۔ اور اس روایتی اخلاقیات کے مقابلہ کے لئے ابھارتے ہیں۔ ایسے روایتی مذہبی رہنما اور ادارے، جنکا صوفیاء سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ تخلیق کاروں سے بھی خوفزدہ ہو کر انہیں سزائیں دیتے ہیں اور پریشان کرتے ہیں۔

تخلیق کار اخلاقی اقدار کی بجائے جمالیاتی رنگ میں اپنے نظریات کو ڈھالتے ہیں۔ یہ

ہماری مدد کرتے ہیں کہ ہم اپنے اندر پنہاں جمالیاتی حسن کو فطری اور انسانی خوبصورتی کے اظہار سے محسوس کریں۔ یہ آوازوں، رنگوں اور لفظوں کے اظہار کے لئے دماغ کے دائیں حصہ کو پنپنے میں مدد دیتے ہیں۔ تاکہ ہم اپنے اندر کے چھپے ہوئے تخلیق کار کو محسوس کر سکیں۔ یہ ہمارے وجود میں چھپے ہوئے بچے کو زندہ رکھتے ہیں جو کھیلنا چاہتا ہے اور زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ تخلیق کار ہمیں فکرِ معاش، فکرِ سخن، فکرِ آرزو سے پرے ایک پرسکون تخیلاتی دنیا میں لے آتے ہیں جہاں ہم اپنی حسِ تخلیق کاری سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خواہ وہ شیکسپیئر (Shakespeare) اور ابسن (Ibson) کے ڈرامے ہوں، پکاسو (Picasso) اور وین گو (Van Gogh) کی مصوری کے شاہکار ہوں، ورجینیا وولف (Virginia Woolf) اور فرانز کافکا (Franz Kafka) کے ناول ہوں یا مرزا غالب اور پبلو نیروڈا (Pablo Neroda) کی شاعری، ہم سب ان کی تخلیق کاری اور روشن خیالی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی ارتقائی نشوونما کی جانب فنونِ لطیفہ اور ادب کی تخلیق ایک بہت بڑا قدم سمجھا جاتا ہے۔

گزشتہ کچھ صدیوں سے بنی نوع انسان فلسفہ اور سائنس کی ترقی سے اپنے ارتقائے نمو کے ایک اور سنگِ میل سے گزر گیا۔ سائنسدانوں نے نہ صرف مذہبی رہنماؤں سے بلکہ صوفیاء اور فنکاروں سے بھی مکالمہ کیا۔ سائنسدان کسی بات کو ماننے سے پہلے منطقی اور عقلی ثبوت پر زور دیتے رہے۔ وہ دو قسم کے حقائق پر یقین کرتے ہیں ایک نفسی حقائق (Subjective Truths) اور دوسرے خارجی حقائق (Objective Truths)۔ کسی حقیقت کو ہر جگہ تسلیم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کو دوسروں پر بھی ثابت کیا جا سکے۔ انہوں نے خوردبینیں اور دوربینیں اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لئے استعمال کیں۔ سائنسدانوں اور فلسفیوں نے زیست کے مختلف پہلوؤں کا کھوج لگایا۔ جیسے کہ علمِ حیاتیات، علمِ نفسیات، علمِ معاشیات، علمِ عمرانیات۔ گزشتہ دو صدیوں سے فلاسفروں اور سائنسدانوں، جیسے چارلس ڈارون، کارل مارکس اور البرٹ آئن سٹائن، کی دریافتوں نے ہمارے فہم و ادراک کو بدل کے رکھ دیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو، دوسروں کو اور ساری کائنات کو کیسے دیکھتے ہیں۔ صورتِ حال کچھ یوں بنتی ہے کہ صوفیاء اور تخلیق کاروں نے مذہبی روایات کو اندر سے اور فلاسفروں اور سائنسدانوں نے باہر

سے کاری ضرب لگائی۔ جہاں صوفیاء اور تخلیق کاروں نے انسان کے دائیں دماغ کی نشوونما میں مدد دی تو فلاسفروں اور سائنسدانوں نے بائیں دماغ کی آبیاری کی۔ بیسویں صدی کے سائنسدان اور فلاسفروں، جیسے برٹرنڈ رسل، ژاں پال سارتر، سگمنڈ فرائڈ اور سٹیفن ہاکنگ، ۔نہ انسانی زندگی اور کائنات کو اسکی انتہاؤں اور گہرائیوں تک سمجھنے میں زندگیاں صرف کیں اور اس پر ہی زور دیا کہ بنی نوع انسان اپنے انفرادی اور معاشرتی مسائل خدا، مذہب، صحائف اور وحی والہام کے بغیر بھی حل کرسکتا ہے۔

جیسے جیسے سائنس اور فلسفہ کے مضامین آگے بڑھے نہ صرف انسانی ذہن بلکہ انسانی معاشرے کی بھی مزید نشوونما ہوئی ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم کی بنیاد سائنسی اقدار پر قائم ہوئی اور حکومتی معاملات میں قوانین غیر مذہبی اور انسان دوستی کی اقدار کی مطابقت میں بنائے گئے۔ بہت سے سائنسدانوں اور فلاسفروں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر سقراط کے نقش قدم پر چلایا' جس نے نوجوانوں کو مذہبی اور سماجی روایات پر سوال اُٹھانے کی تحریک میں زہر کا پیالہ پیا تھا۔

بیسویں صدی میں ماہرینِ نفسیات نے سائنسی اور سیکولر نقطۂ نگاہ سے تخلیق کاروں اور صوفیاء کے تجربات اور واردات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔

ولیم جیمز (William Jame) اور جولین جینز (Julian Jaynes) جیسے ماہرینِ نفسیات انسانی نفسیات کے دائرہ کار کو وسعت دیتے ہوئے اس کوشش میں لگے رہے کہ ہماری روحانیت کا تعلق معبود کی بجائے انسانیت سے ہے۔ ابراہام ماسلو (Abraham Maslow) نے ثابت کیا کہ وہ تجربات جو تصوف اور فنونِ لطیفہ سے معلق ہوتے ہیں ان سے گذرنے کے لئے بنی نوع انسان کو کسی خدا یا خصوصی مذہب پر ایمان رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے تجربات کا تعلق انسانی دماغ کے دہنی حصوں سے ہوتا ہے۔ یہ انسانی لاشعور سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ خداؤں اور فرشتوں سے۔ ان ماہرینِ نفسیات نے انسانی نفسیات کا سیکولر شعبہ متعارف کرایا۔ انسانی دماغ اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے انسانی روایات کی بنیاد سائنسی اور غیر مذہبی اصولوں پر ہوتی ہے نہ کہ صحائفِ مقدسہ پر۔

جیسا کہ ہم اس اکیسویں صدی میں تمام عالم میں بسنے والے گروہوں کا جائزہ لیتے ہیں تو

ہمیں نظر آتا ہے کہ بہت سے لوگ مذہبی روایات میں جکڑے ہوئے ہیں اور مذہبی رہنماؤں کے پاس ہی معاشرتی، معاشی اور سیاسی طاقت ہے۔ ان رہنماؤں نے عوام الناس کو ذاتی اور سیاسی طور پر اپنے مذہبی فرقوں اور صحائف میں جکڑ رکھا ہے۔ جبکہ ان صحائف کے اصولوں پر کوئی دو فرقے بھی متفق نہیں ہوتے۔ دوسری طرف ایسے بھی گروہ ہیں جن کے لئے مذہب کی حیثیت ذاتی نوعیت کی ہے اور وہ معاشرتی اور قانونی معاملات کے بارے میں غیر مذہبی، سائنسی اور انسانی اقدار سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

ایک انسان دوست ماہرِ نفسیات ہونے کے ناطے میرا نظریہ تو یہ ہے کہ بطور بنی نوع انسان اندھی تقلید اور مذہب ہمارا ماضی تھے اور سائنس، نفسیات اور فلسفہ ہمارا مستقبل ہے۔ انسانی ارتقاء کے سفر میں ہم نے مذہبی گروہوں اور تنگ نظریوں سے ترقی کر کے غیر مذہبی نظریوں اور انسان دوستی کے اصولوں کی طرف بڑھنا ہے جہاں تمام شہریوں کو یکساں حقوق اور مراعات حاصل ہوں۔

اس سفر میں صوفیاء، فنکار، سائنسدان، اور فلاسفر اپنے ذاتی، تخلیقی، اور منطقی حقائق کے ساتھ صدیوں سے معاشرتی تبدیلی کے لئے راہیں بناتے چلے آئے ہیں اور انہوں نے ان صدیوں پرانی روایات کو توڑنے کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ ان سارے اختلافات سے بادی النظر انہوں نے سچائی، تخلیقی تخیل اور منطقی فکر کو سامنے رکھتے ہوئے انسانی آزادی کی جہدِ وجہد مسلسل جاری رکھنے کی راہ بنائی۔ انہوں نے معاشرتی شعور اور روشن خیالی کے حصول کے لئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی اور اندھی تقلید سے نکالنے کے لئے عوام کی ہمت بندھائی۔ اس سفر میں صوفیوں' فنکاروں' فلاسفروں اور سائنسدانوں نے تکالیف اٹھائیں مگر انسانیت کے بہتر مستقبل کے لیے راہ ہموار کی۔ انہوں نے جن پگڈنڈیوں پر اپنے سفر کئے وہ آنے والی نسلوں کے لئے بڑی بڑی شاہراہیں بن گئیں۔ گو ایسے تخلیقی لوگ اقلیت میں ہیں۔ لیکن یہ اقلیت انسانی ارتقاء کے سفر میں اکثریت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک مشہور مورخ (Arnold Toynbee) نے لکھا ہے کہ "تخلیقی سوچ رکھنے والوں کو ایک مناسب موقعہ دینا کسی معاشرے میں زندگی وموت کا معاملہ بن جاتا ہے۔ اسی لئے یہ بات اہم ہے کہ آبادی کے چھوٹے سے طبقے کی غیر معمولی تخلیقی قابلیت ہی بنی نوع انسان کا اہم خزانہ ہے۔"

انسانی ارتقاء کا اگلا قدم

تخلیق: خالد سہیل، ترجمہ: رفیق سلطان

نسل انسانی کی ارتقائی سربلندی کا مطالعہ کرتے ہوئے جانوروں اور انسانوں کے تقابل میں ایک فرق واضح طور پر ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے کہ انسان جانور کی نسبت اپنے بارے میں شعوری طور پر خود شناس ہے جبکہ جانور صرف زندہ ہونے کی جبلت کا احساس رکھتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ جانور صرف جانتے ہیں جبکہ انسان جانتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں۔ اس شعوری ادراک کی وجہ سے انسان زبان، کلچر، سائنس، ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ اور علم الاساطیر کی تخلیق و تحقیق پر دسترس حاصل کر سکا ہے۔ انسان ترقی اور نشوونما کے مراحل طے کرتے ہوئے اپنے اور اپنے سماج کے اجتماعی لاشعور سے بھی آشنا ہوتا چلا گیا ہے۔

پچھلی چند صدیوں میں دنیا کے کئی سائنسدانوں، نفسیاتی ماہرین اور فلاسفرز نے ہم پر یہ راز آشکار کیا ہے کہ انسانی لاشعور وسیع الجہات اور کثیر الاشکال ہے۔ چارلز ڈارون Charles Darwin اور دوسرے حیاتیاتی ماہرین نے سب سے پہلے ہمیں جسمانی لاشعور کے وجود کا احساس دلوایا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ زندگی کی ابتدا سمندر سے ہوئی تھی جہاں ایمیبا amoeba کی طرح کے ایک cell والے جرثوموں نے جنم لیا اور کئی ملین سال کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے مچھلی، پرند چرند اور دودھ پلانے والے جانوروں کی صورت میں قدرتی انتخاب Natural Selection کی سخت جان آزمائشوں سے گزرتے ہوئے عالم میں ظاہر ہوئے۔ اس ارتقائی عمل نے انسان کو دل و دماغ کی ترقی پذیر قوت کے ساتھ پیدا کیا۔ یہ کتنی حیران کن بات ہے کہ انسانی جنین لاکھوں سالوں کے ترقیاتی مراحل سے گذرنے کے بعد اب صرف نو ماہ میں اپنی ماں کے رحم میں نشوونما پانے کے بعد جنم لے لیتا ہے۔ انسانی

جرثومہ sperm تخم مادر ovum میں مدغم ہونے کے بعد بار آور بیضے zygote کی صورت میں تبدیل ہوتے ہوئے لاکھوں کروڑوں cell پر مشتمل انسانی بچے fetus کی شکل اختیار کر لیتا ہے انسانی جنین اور اکثر جانوروں کے جنین میں عمل پیدائش کے ابتدائی چند ہفتوں کے دوران مماثلت پائی جاتی ہے۔ جب انسانی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی جبلتیں اور تولیدی عمل لاشعوری نظام حیات کا حصہ بن جاتا ہے اور آہستہ آہستہ شعوری سطح پر ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے جیسے بچے بڑے اور سیانے ہوتے جاتے ہیں وہ زیادہ شعوری ادراک کے حامل ہوتے جاتے ہیں۔

سگمنڈ فرائیڈ Sigmund Freud اور دوسرے نفسیاتی ماہرین نے ہمیں نفسیاتی لاشعور سے روشناس کروایا۔ انہوں نے واضح کیا کہ جب انسانی بچے اپنے والدین، اساتذہ، بزرگوں اور بہن بھائیوں کے ساتھ سماجی عمل میں شریک ہوتے ہیں تو ان میں ایک غیر معمولی شخصیت اجاگر ہوتی ہے اور وہ ایک حفاظتی میکانکی عمل Defence Mechanisms سے آگاہ ہوجاتے ہیں جو ان کی جنسی اور نفسانی خواہشات کو بے لگام ہونے سے بچاتا ہے اور انہیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات اور پریشانیوں سے نبرد آزما ہوسکیں۔

فرائیڈ نے اپنی مریضوں کے خواب اور دوسرے جذباتی مسائل کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے دفاعی عمل کا ایک ایسا سلسلہ مراتب (hierachy) دریافت کیا جو انسان اپنے جذباتی مسائل حل کرتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ شدید جذباتی مسائل میں گھرے ہوئے افراد دماغی بیماریوں جیسے دیوانہ پن یا بے ربط شخصیت اور آزردگی کے افسردہ کن دوروں سے نپٹنے کے لئے جو دفاعی میکانیکی نظام استعمال کرتے ہیں وہ عموماً عدم تعلقی اور انکار کی کیفیت میں سمٹا ہوا ہوتا ہے۔ جبکہ صحتمند اور زندگی سے جڑے بارو زگار افراد زیادہ بلند نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مہذب پیرائے یا ظرافت کو اپنا آلہ کار بناتے ہیں۔ ہر بالغ شخص جتنا وسیع القلب ہوگا اتنا ہی اس کا دفاعی میکانزم مستعد اور پختہ کار ہوگا۔

کارل مارکس Karl Marx اور دوسرے بہت سے ماہرین عمرانیات اور معاشیات نے ہمیں معاشرتی لاشعور کے بارے میں آگاہ کیا ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ بہت سے معاشرتی، معاشی، سیاسی اور کلچرل عوامل نے تاریخی ارتقاء کی سربلندی میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔ مارکس نے جدلیاتی مادیت کا نظریہ پیش کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ کس طرح جاگیردارانہ،

سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ نظام کے پیداواری عمل ہماری نفسیات پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں اور کس طرح صنعتی ترقی انسانیت کو انسانی خصائل سے محروم کر دیتی ہے۔ اس نے سماجی گروہوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں تاریخی عمل سے ہوشیار رہنے کی طرف متوجہ کیا تا کہ وہ شعوری آگاہی کے ساتھ انسانیت کی ترقی میں اپنے حصہ ڈال سکیں۔ بین الاقوامی سطح پر کام کرنے والے نفسیاتی ماہرین ہمیں سمجھاتے ہیں کہ انسانی جذبات اور نفسیاتی مسائل ان ثقافتوں اور تہذیبوں کی پیداوار ہوتے ہیں جن میں انسان بودوباش اختیار کرتا ہے۔ وجودیت اور بشریت کو ماننے والے فلاسفرز Existentialists جیسے ژاں پال سارتر Jean Paul Sartre، ایرک فرام Eric Fromm اور وکٹر فرینکل Victor Frankl نے ہمیں آگاہ کیا کہ انسان اپنے لئے زندگی کی راہ متعین کرنے میں خود مختار ہے اور اپنے ذاتی اور معاشرتی وجود کی حیثیت کے لئے اپنی صوابدید کے مطابق معنی اور مقصد تراش سکتا ہے اور اس کے مطابق حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ انہوں نے ہمیں بڑھاوا دیا کہ اپنی زندگیوں کو مزید بامقصد بنانے کے لئے ذمے داریوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ فرینکل نے واضح کیا کہ انسانی تکالیف اور اذیتیں قابل برداشت ہو جاتی ہیں جب ہم اپنی زندگی کے لئے کوئی مقصد تلاش کر لیتے ہیں۔

بیسویں صدی میں سائینس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت انسان نے جہاں جان لیوا بیماریوں سمیت بہت سے مسائل کا حل ڈھونڈھ نکالا ہے وہیں ایٹم بم اور دوسرے تباہ کن ہتھیار بھی ایجاد کئے ہیں جن کے بربادی کے احوال کسی سے مخفی نہیں۔ میڈیکل سائنس کی ترقی کی وجہ سے بیماریوں سے شفاء کے حصول میں حد درجہ آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں لیکن ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی میں ایسا لگتا ہے کہ انسان خودکشی کے راستہ پر گامزن ہے۔ اکیسویں صدی میں انسانیت ایک دوراہے پر کھڑی ہے چاہے تو ارتقاء کے اگلے قدم کی طرف بڑھ جائے اور چاہے تو اجتماعی خودکشی کو اپنا مقدر بنالے۔ جانوروں میں تبدیلی کا عنصر نیچرل سلیکشن کا مرہونِ منت ہوتا ہے جبکہ انسان شعوری ادراک کی بدولت اپنے لئے ترقی کا راستہ چننے پر قادر ہے۔ اور اس کا درست انتخاب انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسانیت کو بتدریج ترقی کے مراحل سے گذارتے ہوئے آگے کی طرف لے جا سکتا ہے۔

اگر ہم دنیا کے چھ بلین افراد کے بارہ میں معلومات حاصل کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ دنیا رنگ برنگے افراد کی ایک کہکشاں ہے جس کے کچھ رنگ پھیکے اور کچھ شوخ ہیں۔ ایسے افراد، گروہ اور ممالک موجود ہیں جو شاید عمومی طور پر انسانی ارتقا اور بلوغت کے کمتر درجہ میں شمار کئے جا سکتے ہیں جبکہ اس کے برعکس ایسے افراد، گروہ اور ممالک بھی موجود ہیں جو انسانیت کے اعلیٰ معیار پر فائز کئے جا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اونچے درجہ پر فائز بالغ نظر انسانوں میں تین Cs کو مشترک قرار دیا جا سکتا ہے:

Critical Thinking تنقیدی سوچ بچار

بالغ نظر افراد تنقیدی، منطقی اور تجزیاتی سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔ سقراط Socrates اور دوسرے یونانی فلاسفرز نے ایسے کئی تجزیاتی طریقہ کار مرتب کئے ہیں جن کے ذریعے انسان عقلی اور استدلالی نقطہ نظر کے مطابق اپنی روایات اور تہذیب کا جائزہ لے سکتا ہے۔ سوچ کے یہ دھارے سائنس، فلاسفی اور سائیکالوجی کی ارتقائی پیش رفت میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور انہی کے طفیل انسان اپنی معاشرتی بندشوں پر سوال اٹھانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

Creative Imagination تخلیقی ذہن

بالغ نظر افراد ایک ایسی قوت سے مالا مال ہوتے ہیں جو ان میں تخلیقی صلاحیت اور فنونِ لطیفہ کے لئے شوق اور جستجو کا مادہ پیدا کر دیتی ہے۔ ان میں سے بعض ایسی تخلیقی شخصیات ہوتی ہیں جو ادب، شاعری، ڈرامہ اور مصوری میں اونچا مقام حاصل کرتی ہیں۔ ان میں ایک ایسی بھرپور ذوقی صلاحیت موجود ہوتی ہے جو انہیں اپنے گروہ اور کلچر میں ممتاز بناتی اور سب کو ساتھ لیکر چلنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ٹیلیوژن، پرنٹ میڈیا اور اب انٹرنیٹ کی وجہ سے ان نابغہ روزگار شخصیات کی تخلیقات دنیا کے ہر کونے میں دیکھی، سنی اور پڑھی جا سکتی ہیں۔

Compassionate Heart ہمدردانہ رویہ

معاشرے کے بالغ نظر افراد بلا تخصیص مذہب و ملت سب کے ساتھ مساوی سلوک روا رکھتے ہیں۔ وہ اختلافات کو ہوا دینے کی بجائے یک جہتی اور مشترکہ خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ ذات پات، برادری اور نسلی تفاخر کے بھید بھاؤ سے نکل کر کل انسانیت کا بھلا چاہتے

ہیں۔ وہ سائنسدان جنھوں نے پنسلین اور انسولین جیسی ادویات ایجاد کی ہیں ان کا مقصد صرف اپنے خاندان یا گروہ کو فائدہ پہنچانا نہیں تھا بلکہ وہ ساری دنیا کو اس کے فوائد سے مستفید کرنا چاہتے تھے۔ ایسی نابغہ روزگار شخصیات دنیا سے بیماری اور دکھ کا خاتمہ کر کے پوری انسانیت کا معیار بلند کرنا چاہتے ہیں۔ کئی فلاسفرز اور ریفارمرز نے معاشرتی شعور کو عام لوگوں تک پہنچانے کی بے انتہاء جدوجہد کی ہے تاکہ انسانیت کا بول بالا ہو سکے اور یہی شعور بڑے گروہ اور جماعتیں کو رحمدلانہ رویہ اپنانے میں مددگار بن سکے۔

تخلیقی ذہین کی مالک ایسی رحم دل ممتاز شخصیات چاہے وہ سائنسدان ہوں، آرٹسٹ، شاعر، فلاسفر، ریفارمر یا انقلابی ہوں وہ انسانیت کو ارتقاء کے اگلے قدم کر راستہ دکھانے میں کوشاں رہتی ہیں۔ اس کے لئے ان کی کوشش ہے کہ عوام الناس منطقی اور استدلالی طرز فکر کو اپنائیں اور اپنے تصورات کو تخلیقی موڑ دیں۔ میل جول میں بردباری اور مروت کی عادت ڈالیں۔ ان اکابرین کی خواہش ہے کہ ہم گروہی عصبیت اور غیر ضروری بے مقصد معاشرتی بندشوں کے حصار توڑ دیں تاکہ ایک پرامن اور بقائے باہمی کے سفر کا آغاز ہو سکے۔ ہمیں ایسی جماعتیں، کلچر اور ملک بنانے ہیں جہاں تمام شہریوں کو نہ صرف مساوی حقوق بلکہ مساوی مراعات اور مواقع بھی حاصل ہوں اور ہر شخص اپنی امکانی ترقی اور فلاح کے حصول میں آزاد ہو۔ ہم انفرادی، معاشرتی اور سیاسی اختلافات کو امن و امان کے ساتھ حل کر سکیں۔ شاید یہی وہ واحد راستہ ہے جو ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر آگے بڑھنے اور ارتقاء کی نئی منزل تک لے جا سکتا ہے۔

روایتی اکثریت اور تخلیقی اقلیت

تخلیق: خالد سہیل، ترجمہ: رفیق سلطان

انسانی نفسیات کا طالبعلم ہونے کے ساتھ ساتھ میں ایک پیشہ ور نفسیاتی معالج بھی ہوں اور مجھے انسانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگیوں میں ذہنی ارتقاء کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا ہے۔ پچھلی کئی دہائیوں سے متعدد ماہرین نفسیات نے انسانی شخصیت کے بارہ میں دلچسپ اور حیران کن نظریات پیش کئے ہیں۔ اپنے سماجی اور پیشہ ورانہ تجربے کی بنیاد پر میں بھی ایک تھیوری theory پر کام کر رہا ہوں جسے میں روایتی اور تخلیقی شخصیات کے نام سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میں اس مضمون میں اس تھیوری کے خدوخال اپنے قارئین پر واضح کرنے کی کوشش کرونگا۔

فطری ذات Natural Self

ولادت کے وقت سے تمام بچے ایک منفرد فطری رجحان اور مزاج لئے پیدا ہوتے ہیں جسے ہم ان کی مخصوص فطری صلاحیت کہہ سکتے ہیں۔ ہم اس عمل کو بیج اور پودے کی نشوونما سے عبارت کر سکتے ہیں۔ جیسے بیج کو ایک تناور درخت بننے کے لئے زرخیز زمین، مناسب روشنی اور تازہ ہوا کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ پھل پھول دے سکے بالکل اسی طرح بچوں کو بھی ایک محبت بھرے ہمدرد گھر، سکول اور سماج کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ ایک صحتمند، کامیاب اور صلح جو انسان بن سکیں۔ ایسے بچے جو حقارت، گالی گلوچ اور پرتشدد ماحول میں پرورش پاتے ہیں ان کے لئے امکان غالب ہے کہ بالغ ہونے پر تلخی، نفرت اور تشدد ان کی ذات کا حصہ بن جائے

اور وہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے ماحول اور سماج کے لئے بھی ایک خطرہ بن جائیں۔

روایتی اور تخلیقی ذات

بچوں کے بلوغت میں داخل ہونے کے ساتھ ان کی ذات میں دو طرح کی تبدیلیاں نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

الف: تقلیدی شخصیت Conditioned Self

ایسی شخصیت اپنے خاندان، سکول، گروہ اور کلچر کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ ایسے لوگ عموماً (should, have to and must) یہ ہونا چاہئے، ایسے کرنا چاہئے اور لازماً ایسا کرنا پڑیگا جیسے الفاظ کی گردان کا شکار رہتے ہیں۔

ب: تخلیقی شخصیت Creative Self

ایسی شخصیت تخلیقی وسعت فکر کی مالک ہوتی ہے اور اپنے اہداف (like to, want to and love to do) لوگ کیا پسند کرتے ہیں، کیا چاہتے ہیں اور کیا کرنے میں لطف اندوز ہوتے ہیں کی بنیاد پر استوار کرتی ہیں۔

روایتی اور تخلیقی شخصیات

انسانی شخصیت جہت پہلو روشنیوں کی ایک قوس قزح کی مانند ہے۔ رنگوں کے اس سلسلے کے ایک طرف روایتی شخصیات ہیں جنہوں نے تقلیدی رویوں کو اپنا طرز عمل بنالیا ہے جبکہ روشنیوں کی دوسری طرف تخلیقی شخصیات ہیں جنہوں نے اپنی ذات کو آئین نو کا ترجمان بنالیا ہے۔ متعدد صحتمند اور خوش باش افراد نے تخلیقی اور تقلیدی کے مابین ایک خوشگوار توازن قائم کر رکھا ہے جبکہ دوسرے بہت سے افراد تضاد کی راہوں میں بھٹک رہے ہیں۔ ایسے تضادات اندیشوں، شرم، احساس جرم اور دل شکستگی کو جنم دیتے ہیں حتیٰ کہ (breakdown) ذہنی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سب اس وقت نمایاں ہو کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے جب تخلیقی ذہن وہ سب کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے جسے تقلیدی ذہین یکسر غلط، برا اور اخلاقی گراوٹ کا سبب سمجھتا ہے۔

سماجی روایتی تقلیدیت کے تین سرچشمے

انسانی نفسیات کے طالبعلموں کے لئے تین سوال بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

صحیح کیا اور غلط کیا ہے؟

اچھا کیا اور برا کیا ہے؟

گناہ کیا اور نیکی کیا ہے؟

ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لئے جب ہم مختلف گروہوں اور ثقافتوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ صحیح اور غلط، اچھائی اور برائی، گناہ اور نیکی کی صفات تین رویوں پر مبنی ہیں۔

1- مذہبی رویہ

کچھ ثقافتوں میں مذہب ایک اہم جزو اور احکام الٰہی کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ لوگ خدا، پیغمبروں، صحیفوں اور مذہبی علماء کو توقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مذہبی علماء چاہے وہ پادری یا پنڈت ہوں، مولانا یا ربّی ہوں عموماً لوگوں کو کیا کرنے اور کیا نہیں کرنے کا درس دیتے ہیں اور لوگوں کا کون سا فعل گناہ کے دائرہ کار میں آئے گا جس کے لئے انہیں دنیا اور آخرت میں جوابدہ ہونا پڑیگا۔ چنانچہ وہ لوگ جو مذہبی صحیفوں کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہو پاتے وہ احساس جرم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان ثقافتوں میں صحیح اور غلط کی کسوٹی خدا اور صحیفوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔

2- قانونی رویے

ایسے کلچرز جہاں دنیاوی طرز کے قوانین کا رواج ہو وہاں قانونی روایت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ وہاں پر ایسے آئین مرتب کیے جاتے ہیں جو شہریوں کے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں اور انہیں قانون کے دائرہ کار میں رہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور ایسے افراد جو قانون شکنی کرتے ہیں انہیں باقاعدہ عدالتوں کے ذریعے جیل کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ ایسے دنیاوی معاشروں میں حکومت الٰہیہ کی بجائے انسانوں کو فیصلے کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

3- صحت عامہ

بعض معاشرے اپنے شہریوں کی صحت اور تندرستی کے معاملے میں بہت فکرمند ہوتے

ہیں۔ ڈاکٹر، نرسز، نفسیاتی معالج اور سائنسدان صحت عامہ کے بارہ میں راہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ یہ پیشہ ور افراد اپنے مشاہدات اور تجربات کا نچوڑ عوام کی صحت اور فلاح و بہبود کے لئے پیش کرتے ہیں۔ رہنمائی کے ان اصولوں اور ضابطوں پر عمل کر کے عامتہ الناس ذہنی اور جسمانی طور پر صحتمند اور توانا رہ سکتے ہیں۔ اور اگر لوگ ان ہدایات کو بروئے کار نہیں لائیں گے تو امکان ہے کہ وہ بیماری اور تکلیف کا شکار ہو جائیں۔

دنیا کے بہت سے معاشروں میں مذہب، قانون اور صحت سے متعلق متفرق رویے قائم ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ ارتقائی مراحل طے کرتے رہتے ہیں۔

روایتی اکثریت اور تخلیقی اقلیت

انسانی تہذیبوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تقریباً ہر گروہ اور ثقافت میں ایک روایتی اکثریت کے ساتھ ساتھ ایک تخلیقی اقلیت بھی موجود ہوتی ہے۔ روایتی شخصیت کے حامل افراد قانون کی پابندی کو زندگی کا حصہ بنا لیتے ہیں، اداروں اور تنظیموں کی پاسبانی اور حمایت کرتے ہیں چاہے یہ ادارے معاشرتی یا ثقافتی ہوں، مذہبی یا سیاسی ہوں۔ تصویر کے دوسرے رخ پر تخلیقی شخصیات ہوتی ہیں جو حاکیت کو للکارتی اور ایسے قوانین اور ضابطوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہیں جو نامعقول اور ناانصافی پر مبنی ہوں اور معاشرتی گھٹن کا باعث بنتے ہوں۔ اس تجزیے کے دوران ایک دلچسپ صورت حال ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اگر ہم کسی ثقافت کی ارتقائی منازل کا جائزہ لیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک صدی کی تخلیقی اقلیت آہستہ آہستہ روایتی اکثریت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اگلی صدی ایک اور جدید تخلیقی اقلیت کو جنم دیتے ہوئے ارتقا کو اگلے پڑاؤ پر لے جاتی ہے۔ یہ بات حیران کن ہے کہ کس طرح ایک صدی کے باغی اگلی صدی میں کے رہبر بن کر سامنے آتے ہیں۔

تخلیقی شخصیات کی سوانح عمریاں

تخلیقی شخصیات کی سوانح عمریوں کے مطالعے سے یہ امر نمایاں ہوتا ہے کہ وہ شخصیات چاہے سائنسدان اور فنکار ہوں، شاعر یا فلاسفر ہوں، مصلح یا انقلابی ہوں اکثر و بیشتر اذیت اور ناگوار صورت حال میں گرفتار رہے ہیں کیونکہ وہ روایتی خاندانوں، گروہوں اور ثقافتوں سے

جدید قانون کی حاکیت کے لئے اکثر و بیشتر الجھتے رہے ہیں۔ اور یہ امر بھی غیر معمولی نہیں ہے کہ انہی معاشروں نے آنے والے وقت بلکہ بعض اوقات صدیاں بعد بھی ان نابغہ روزگار افراد کو توصیف و تعریف اور پذیرائی سے پیہم نوازا۔ ہم بیسویں صدی میں اس قسم کے کئی واقعات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ میں اس موقع پر صرف دو واقعات پیش کرونگا جسمیں سے ایک سیاسی دنیا اور دوسرا سائنس اور مذہب کی دنیا سے متعلق ہے۔

ساؤتھ افریقہ کے نیلسن منڈیلا نے سفید فام اقلیتی حکومت کی نسل پرستی پر مبنی نسلی امتیاز کے قوانین اور طرز عمل کے خلاف آواز بلند کی۔ اسے نہ صرف جیل میں بند کیا گیا بلکہ اس پر دہشت گرد ہونے کا الزام بھی عائد کیا گیا۔ پھر قریب ربع صدی تک جیل میں بند رہنے کے بعد رہائی ملنے پر اسے ایک حریت پسند اور وطن کی آزادی کا سپہ سالار قرار دیا گیا۔ نیلسن منڈیلا کو ساؤتھ افریقہ میں ایک کثیر النسل اور کثیر الثقافت جمہوری حکومت قائم کرنے پر امن کے عالمی نوبل انعام سے نوازا گیا۔ دوسری مثال کیتھولک چرچ کے اس اقرار کی ہے کہ ان کے ادارے نے تین سو سال قبل گلیلیو Galelio کی زمین کے بارہ میں دریافت کو قابل تعزیر قرار دیا تھا کیونکہ اسکا یہ انکشاف بائبل کی ایک روایت کے لفظی ترجمہ سے اختلاف رکھتا تھا۔

ہر گروہ اور معاشرے میں تخلیقی ذہن انسانی حقوق اور شخصی آزادی کے لئے برسرِ پیکار ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ نسل انسانی کو اپنی تخلیقی کاوشوں میں نت نئے تجربات آزمانے کے لئے ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہونا چاہیئے۔ ضروری ہے کہ یہ تخلیقی قوت نہ صرف آرٹ اور سائنس میں اپنے اظہار کے لئے آزاد ہو بلکہ محبت، پیار اور روحانیت کے بارہ میں بھی اپنے رشحات فکر بے دھڑک بیان کر سکے۔ تخلیقی شخصیات کا خیال ہے کہ مذہبی اور سیاسی اداروں کی ناروا پابندیاں ذہین لوگوں کے تخلیقی جوہر کو ماند کر دیتی ہیں۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ دنیا کے مختلف معاشروں اور ثقافتوں میں تخلیقی اقلیت اور روایتی اکثریت کے مابین اختلافات ابھرتے رہتے ہیں۔ یہ اختلافات آگے چل کر تلخ اور ناقابل برداشت ہوتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات پرتشدد جھڑپوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف روایتی اکثریت اور تخلیقی اقلیت اتفاق اور پرامن طریقے پر بقائے باہمی کے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک ایسا ماحول ترتیب دے رہے ہوتے ہیں جو قوموں کی ارتقاء اور بہبود کے لئے ضروری ہے۔ ایسے ادوار میں تخلیقی اقلیت کھلے دل کے ساتھ روایتی

اکثریت کی ان کوششوں کو سراہتی ہے جو وہ گزری نسل کی تخلیقی سوغات کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ تخلیقی اقلیت اور روایتی اکثریت کے مابین یہ ایک قابل ستائش کوشش ہے جو انتہائی سیر حاصل اور ترقی پسندانہ نتائج پیدا کرتی ہے۔ ایسا توازن خاندانوں، معاشروں اور ثقافتوں کے درمیان پیدا کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے لیکن یہ ایک ایسا نصب العین ہے جس کے لئے ہمیں اپنے جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے۔

پابند اور مختار نظام

تاریخ کی چھان بین سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب کوئی نظام پابندیوں کی جکڑ بند کا شکار ہو جائے تو وہ وقت کے ساتھ ترقی کی منازل طے نہیں کرسکتا بالکل اس طرح جیسے ایک بہتا ہوا دریا اگر ٹھہرے ہوئے گدلے پانیوں میں تبدیل ہو جائے تو وہ اپنے تمام تازگی اور مٹھاس کھو دیتا ہے۔ دوسری طرف جب کسی نظام کو ایسے افراد کی رہنمائی میسر ہو جو جدید خیالات کو اپنانے اور انہیں بروئے کار لانے کی صلاحیت سے مالا مال ہوں تو ایسا معاشرہ مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن رہتے ہوئے بہترین نتائج پیدا کرسکتا ہے۔ اور زندگی قدم بقدم منزل بمنزل آگے کی سمت رواں دواں رہتی ہے۔ کسی بھی معاشرے اور ثقافت میں مختلف لوگ چاہے وہ روایتی ہوں یا تخلیقی اپنے آدرشوں کو حاصل کرسکتے ہیں اور سماج میں اپنے لئے ایک باعزت مقام پیدا کرسکتے ہیں بشرطیکہ وہ بھی دوسروں کے اس حق کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں معاشرے میں ایک متوازن زندگی گذارنے کا موقع فراہم کریں۔ گذرتے وقت کے ساتھ ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اتحاد میں تنوع ہے اور تنوع میں اتحاد اور مستقبل میں ترقی اور ارتقاء کے یہی رہنما اصول ہیں۔ مجھے امید ہے کہ روایتی اکثریت اور تخلیقی اقلیت ایک دوسرے کے کام کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھیں گے اور انسانیت کی بقاء اور بہتری کے لئے مل کر کام کرینگے۔ مثال کے طور پر اگر انسانیت کو ایک ناؤ سے تشبیہ دے لی جائے تو روایتی اکثریت اس کے لنگر کی مانند ہے اور تخلیقی اقلیت اس کے بادبان کی طرح ہے۔ اسی طرح اگر انسانیت کو ایک درخت سے تشبیہ دے دی جائے تو روایتی اکثریت اس کی جڑیں اور تخلیقی اقلیت اس کی شاخیں اور پھل پھول ہیں۔ انسانی تاریخ کے ہر باب میں روایتی اکثریت ہمارے درخشاں ماضی اور تخلیقی اقلیت ہمارے سنہرے مستقبل کے لئے ایک مشعل کی طرح روشن تحریک ہیں۔

تاریخی ملاقات

تخلیق: خالد سہیل، ترجمہ: گوہر تاج

جب عرفان نے مجھے اس تاریخی ملاقات کی دعوت دی تو مجھے چنداں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ وہ ملاقات اس قدر یادگار ملاقات ثابت ہوگی۔ عرفان نے اس ملاقات کے بارے میں تفصیلات بتانے سے گریز کیا تھا کیونکہ وہ مجھے حیران کرنا چاہتا تھا۔ جب میں ایرپورٹ پہنچا تو وہ مجھے لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ گھر پہنچ کر ہم دونوں نے مل کر رات کا کھانا کھایا اور پھر سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اگلی صبح وہ مجھے اس میٹنگ کی جگہ لے گیا اور مجھ سے کہا کہ میں لوگوں میں خود ہی گھل مل جاؤں کیونکہ بطور منتظم اسے اس تقریب کے انعقاد کی ذمہ داری اٹھانی تھی۔

میں اپنے طور پر ادھر ادھر گھومتا رہا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ایک بڑے پیمانے پر تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک جانب دنیا بھر سے مدعو کیے ہوئے دانشور حضرات کی تقاریر کے لیے ہال تھے اور دوسری طرف ایک بڑے سے میدان میں شامیانے لگے ہوئے تھے جو دور سے کاٹجز Cottages لگ رہے تھے جن کے دروازے کے باہر ایک بینر Banner بھی لگا ہوا تھا۔ اپنے تجسس کے باعث میں نے تقاریر سننے کی بجائے ان شامیانوں میں جانے کا فیصلہ کیا۔

پہلے شامیانے کے باہر 'اکیسویں صدی کے لوگ' کا بینر لگا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں تو مجھے وہ بینر بے معنی سا محسوس ہوا۔ میں نے سوچا دنیا میں رہنے والے تمام سات عرب افراد آخر اکیسویں صدی میں ہی تو بستے ہیں۔ مگر میں نے اپنی اس طنزیہ سوچ کو اپنی حد تک ہی رکھا اور اندر داخل ہو گیا۔ شامیانے میں بے شمار لوگ ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ کچھ ایک طرف بیٹھے ہوئے کتابیں پڑھ رہے تھے جبکہ کچھ ایک دوسرے سے بڑے دل جمعی سے تبادلہ خیال کر

رہے تھے۔ میں ان کے ذرا قریب ہو لیا تا کہ پتہ چلے کہ کیا گفتگو ہو رہی ہے۔ مجھے یہ جاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ وہ سٹیون ہاکنگ Stephen Hawking کی تازہ کتاب دی گرینڈ ڈیزائن The Grand Design پہ گفتگو کر رہے تھے۔

پہلے آدمی نے کہا 'اس کتاب کو پڑھنے سے مجھے یہ اندازہ ہوا ہے کہ ہم محض ایک کائنات uni-verse کی بجائے کئی کائناتوں multi-verse میں رہ رہے ہیں۔ یہ جاننے کے بعد میرا دنیا کے متعلق نقطۂ نظر یکسر تبدیل ہو گیا ہے۔

دوسرے آدمی نے جواب دیا 'اور میں یہ پڑھ کر حیران ہوں کہ بگ بینگ کا نظریہ Big Bang Theory شاید درست نہیں ہے اور یہ سوال کہ دنیا کس طرح وجود میں آئی کتنا بے معنی ہوتا جا رہا ہے۔

تیسرے آدمی نے لقمہ دیا 'میرے لیے بلیک ہول Black Hole کا تصور ہی مسحور کن تھا۔ کتنی ہی بار یہ ہوا کہ ایک کائنات اس بلیک ہول میں غائب ہو گئی اور پھر بالکل ایک نئی کائنات نے اس میں سے جنم لیا۔ کائنات کے مر جانے اور دوبارہ جنم لینے کا سلسلہ قرن ہا قرن سے جاری ہے۔ اب ضرورت ہے کہ ہم اپنے وقت اور کائنات کی آفرینش کے متعلق تصور پہ نظرِ ثانی کریں' چوتھے آدمی نے سوال کیا " مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر لاکھوں افراد ان حقائق کو قبول کیوں نہیں کرتے؟"

پانچویں آدمی نے جواب دیا " اس لیے کہ وہ اکیسویں صدی میں نہیں رہ رہے"۔

اور عین ان لمحے مجھے ابتدا میں پڑھے 'اکیسویں صدی' کے عنوان کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔

پھر میں اس شامیانے سے نکل کر اس شامیانے میں داخل ہوا جس کی پیشانی پر 'بیسویں صدی کے لوگ' لکھا تھا۔ جہاں کے لوگ اکیسویں صدی کے افراد کے مقابلہ میں قدرے قدامت پرست لباس پہنے ہوئے تھے۔ جب میں نزدیک آیا تو دو خواتین نفسیاتی علاج کے بارے میں تبادلۂ خیال میں مصروف تھیں۔

جب انہوں نے مجھے خوش دلی سے خوش آمدید کہا اور گفتگو میں شامل ہونے کی دعوت دی تو میں نے ان سے سوال کیا کہ کس قسم کی سائیکو تھیرپی psychotherapy کا طریقہ اپنے مریضوں کے علاج کے لیے استعمال کرتی ہیں تو ایک نے کہا " میں روایتی قسم کی معالج ہوں اور

فرائڈ Freud کے نظریۂ فکر کی قائل ہوں۔ مریضوں کو کاؤچ couch پر لٹاتی ہوں۔"

" آپ اپنے مریضوں کو کتنی دفعہ دیکھتی ہیں؟"

" ایک گھنٹے کے لیے ہفتے میں پانچ دن"۔

" اور کتنے عرصے کے لیے؟"

" یہی کوئی چار سے چھ سال"

" میرا تو خیال تھا کہ زیادہ تر معالج اس طریقۂ علاج کو مسترد کر چکے ہیں۔ وہ اپنے مریضوں سے منہ در منہ گفتگو کرتے ہیں اور ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ ہی دیکھتے ہیں۔"

" مگر میں فرائڈ کا نقطۂ نظر رکھنے والی معالج ہوں اور اسی انداز سے اپنے مریضوں کو دیکھتی ہوں جیسے سگمنڈ فرائڈ دیکھا کرتے تھے۔"

اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ وہ بیسویں صدی کی عورت کیوں ہے۔ یہ ان میں سے ہے جو جسمانی طور پر تو اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں مگر دراصل بیسویں صدی کے افراد کے خیالات کے حامل ہیں۔ میں اسے یہ کہہ کر خفا نہیں کرنا چاہتا تھا کہ آج اگر فرائڈ زندہ ہوتا تو وہ بھی اپنے طریقۂ علاج کو تبدیل کر چکا ہوتا۔

اب میں جس اگلے شامیانے میں داخل ہوا اس میں انیسویں صدی کے افراد تھے۔ جب میں نے ایک معمر شخص سے' جو روایتی لباس میں ملبوس تھا' پوچھا کہ اس کا فلسفۂ حیات کیا ہے تو اس نے کہا کہ وہ روایتی مارکسی نظریہ کا حامل ہے۔ ہماری گفتگو کے دوران جب میں نے اس سے کہا کہ جب لینن Lenin نے مارکس Marx کے خیالات پر عمل کیا تو اس کے نتائج محدود ثابت ہوئے تو وہ مجھ سے متفق نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ دراصل خامی نظریہ کے غلط طریقۂ کار میں تھی۔ اس میں اس فلسفۂ فکر کا ہرگز قصور نہ تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے اپنے وہ مسلمان دوست یاد آ گئے جو کہتے ہیں کہ خرابی اسلام میں نہیں مسلمانوں میں ہے۔ جب ان مارکسی صاحب نے میری رائے دریافت کی تو میں نے کہا کہ میں کارل مارکس کی بہت عزت کرتا ہوں۔ وہ ایک نہایت ذہین شخص تھا اور اس کا انسانی حالتِ زار کی سمجھ بوجھ میں نمایاں مقام ہے مگر پچھلی دو صدیوں میں ہم اور بھی بہت کچھ جان چکے ہیں۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس کے نظریہ کو زمانے کے لحاظ سے نئی پوشاک اڑھائیں۔ جب اس نے مزید استفسار کیا تو

میں نے اسے بتایا کہ مارکس محض طبقاتی عدم مساوات اور طبقاتی تجزیہ کے مطالعہ میں ہی مصروف عمل تھا۔ مگر آج ہم جانتے ہیں کہ کسی سماج' ملک یا ثقافت کی سماجی' معاشی اور سیاسی حالت کی طبقاتی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ہمیں نسلی' نظریاتی' جنسی' قومی تفریق اور مذہبی جدوجہد پر بھی ارتکاز کی ضرورت ہے۔ میری باتیں سن کر قدامت پسند مارکسی مسکرایا اور گویا ہوا' وہ ساری جنگیں بھی اہم ہوسکتی ہیں مگر سب سے اہم تو طبقاتی جنگ ہی ہے' اس گفتگو کے بعد میں اس سے ہاتھ ملا کر شامیانے سے نکل گیا۔ میں کچھ دیر اس علاقے میں گھومتا رہا۔ مجھے خیال آیا کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں ہر شامیانے میں جاسکوں اور ہر صدی کے لوگوں سے مل سکوں۔

یہ سوچ کر میں ساتویں صدی کے لوگوں کے شامیانے میں گھس گیا۔ اس شامیانے میں بے شمار قدامت پرست مسلمان تھے جن کے چہروں پر داڑھیاں' سروں پر ٹوپیاں اور ہاتھوں مین تسبیحیں تھیں۔ ان کے درمیان اس بات پر گرما گرم گفتگو ہو رہی تھی کہ روزہ رکھنے' حج پہ جانے اور زکواۃ کی ادائیگی کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ اور آیا جہاد کا مطلب تزکیہ نفس ہے یا کافروں کے خلاف جنگ کا اعلان۔ ان میں سے بہت سوں کو اس بات پر مسرت تھی کہ افغانستان میں اسامہ بن لادن اور ملا عمر کے ماننے والوں نے گوتم بدھ کے مجسمے توڑ دیے تھے کیونکہ حقیقی اسلامی روایات میں تمام مجازی خداؤں اور بتوں کو مسمار کرنے کی ہدایت ہے۔

اب میں جس شامیانے میں داخل ہوا اس میں قبل مسیح کے افراد تھے۔ میں قریب گیا تو پتہ چلا کہ وہ روایتی یہودی تھے۔ ان کی داڑھیاں لمبی اور بال گھنگھریالے تھے۔ وہ کالی ٹوپیاں اور لمبی قبائین پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض آگے پیچھے ہلتے ہوئے دعائیں بھی مانگ رہے تھے جبکہ دوسرے کچھ افراد موسیٰ کے فرعون کے دربار میں ہونے والے معجزات کے ذکر میں مصروف تھے۔ جب میں نے ان سے یہودی قانون کے بارے مین پوچھا تو ایک نے کہا 'آنکھ کا بدلہ آنکھ'۔ جب میں نے اس سے کہا کہ اس قانون پر عمل کیا گیا تو آدھا گاؤں کانا ہو جائے گا تو اس نے کہا کہ میں اس کے اعتقادات کی بے عزتی کر رہا ہوں۔ اس کی بات سن کر میں نے معذرت کی اور وہاں سے نکل گیا۔

اس شامیانے سے نکلنے کے بعد میں گھر جانے کا ارادہ کرنے لگا مگر مجھے دو اور شامیانے

دکھائی دیے جو باقی شامیانون سے قدرے فاصلے پر ایستادہ تھے۔ جب میں نے قریب جا کر دیکھا تو ان کی پیشانی پر بائیسویں اور تیئسویں صدی کے بینر لگے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا گھر جانے سے پہلے ان لوگون سے بھی مل لیا جائے۔ لہٰذا پہلے میں بائیسویں صدی کے لوگوں والے شامیانے میں داخل ہوا۔ جب میں نے ان میں سے ایک سے گفتگو شروع کی تو اس نے بتایا کہ وہ ایک قدامت پرست مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا مگر جب وہ لڑکپن میں داخل ہوا اور اس نے سائنس' فلسفہ اور نفسیات کا علم حاصل کیا تو اس نے دنیا کے تمام مذاہب کو الوداع کہہ دیا کیونکہ وہ قبائلی سوچ کے آئینہ دار ہیں۔ اب اس کا یقین ہے کہ دنیا کے ہر طرف باشعور لوگ روایتی مذاہب کو خیر باد کہہ رہے ہیں اور اس بات کی اہمیت کو محسوس کر رہے ہیں کہ ان کہنہ سال کداؤں سے زیادہ اہم انسان ہیں۔

میری آخری ملاقات تیئسویں صدی کے افراد سے ہوئی جب میں نے ان میں سے ایک عورت سے بات کی تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک قدامت پرست یہودی خاندان میں پیدا ہوئی تھی جہاں کوشر kosher کھنا کھایا جاتا تھا اور لوگوں کو تورات پر ایمان تھا۔ اس کا خواب تھا کہ وہ اسرائیل جائے اور اس خطے کا دیدار کرے جس کا وعدہ آسمانی کتاب میں کیا گیا تھا۔ لیکن جب وہ جوان ہوئی اور اس نے انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا تو اسے پتہ چلا کہ مذاہب کی بنیاد لوک ورثے اور اساطیری کہانیوں پر ہے۔ اسے اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ انسان اتنے مغرور اور متکبر ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے 'منتخب بندے Chosen People' سمجھتے ہیں۔ اس عورت کا کہنا تھا کہ انسان نہایت غیر ذمہ دار واقع ہوئے ہیں اور انہوں نے دھرتی ماں کے ساتھ برا سلوک کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اس کی ایک مثال جنگلات کا خاتمہ ہے۔ انہوں نے نہ صرف درخت کاٹے جو انسانوں کو اوکسیجن oxygen فراہم کرتے ہیں بلکہ بہت سے جانوروں' پرندوں اور حشرات الارض کا بھی خاتمہ کر دیا۔

اس عورت کا خیال تھا کہ انسانوں کو اپنے فطری ماحول کے مل جل کے ہم آہنگی کی زندگی گزارنا سیکھنا چاہیے۔ انہیں جانوروں کو اپنا بھائی اور پرندوں کو اپنی بہنین سمجھنا چاہیے۔ اس کا یہ یقین تھا کہ ہم سب دھرتی ماں کے بچے ہیں۔ میں اس عورت سے بہت متاثر ہوا جو مجھے ایک روشن خیال عورت نظر آ رہی تھی۔

جب میں عرفان کے گھر لوٹا تو میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے اتنی فکر انگیز ملاقات میں دعوت دی جس میں شمولیت سے مجھے اندازہ ہوا کہ حالانکہ سات ارب انسان جسمانی طور پر تو اکیسویں صدی میں رہ رہے ہیں مگر ذہنی طور پر وہ مختلف صدیوں کے باسی ہیں۔

اگلے دن عرفان مجھے ایرپورٹ واپس لے گیا۔ جب میں اپنی پرواز کا انتظار کر رہا تھا تو عرفان نے کہا 'اس سے پہلے کہ میں کسی اور سے تبادلۂ خیال کروں میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں 'یہ شخص ذہنی طور پر کس صدی میں رہ رہا ہے؟' اس سوال کے بعد میرے لیے اس انسان سے گفتگو کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

جانے سے پہلے میں نے عرفان کا اتنی بصیرت افروز کانفرنس کے اہتمام کا شکریہ ادا کیا جس میں مختلف صدیوں کے افراد کو جمع کیا گیا تھا۔ عرفان نے کہا کہ میرے ذوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے اندازہ تھا کہ میں اس کانفرنس کو پسند کروں گا۔ واپسی کا سفر کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ وہ ملاقات کئی حوالوں سے تاریخی ملاقات تھی۔

میں ڈاکٹر خالد سہیل سے آج تک ملا تو نہیں لیکن ان کا تعارف انکی کتابوں "بھگوان ایمان اور انسان" "انفرادی اور معاشرتی نفسیات" اور "سماجی تبدیلی" کے ذریعے سے ہوا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں لیکن ایک خواہش ضرور تھی کہ انکی کتابیں میں اپنے ادارے سے شائع کروں اور پھر جب پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب تو واقع ڈاکٹر ہیں اور کینیڈا جیسے ملک میں اپنا ایجاد کردہ گرین زون تھیراپی Green Zone Therapy طریقہ کے ذریعے لوگوں کا علاج کرتے ہیں اور موصوف کا اپنا کلینک ہے۔ میں نے فوراً ان سے رابطہ کیا اور اندر ایک خوف بھی تھا کہ موصوف کینیڈا جیسے ملک میں رہائش پزیر ہیں اور پھر کتابیں بھی علمی لکھ رکھی ہیں ہو سکتا ہے ہمیں اجازت نہ دیں۔ لیکن میں حیرت زدہ رہ گیا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنی کتابیں شائع کرنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ بڑی خندہ پیشانی سے بات کی۔ میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور سوچ دونوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا پھر جب پہلی کتاب شائیزوفرینیا شائع کی تو پورے ملک میں سراہا گیا خود ڈاکٹر صاحب کو اسکی طباعت بڑی پسند آئی اور یہی وجہ ہے کہ اب یہ نئی کتاب بھی شائع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ڈاکٹر خالد سہیل کی علمیت اور قابلیت کا اندازہ آپ انکی کتابوں کی فہرست کے ذریعے سے بھی لگا سکتے ہیں۔ آپ کا فلسفیانہ انداز تحریر لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے اور اس میں گم ہوتے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور یہ اندازہ آپ کو "انسانی شعور کا ارتقاء" کا مطالعہ کرنے کے بعد ہوگا۔ میں تو ایک بات کہتا ہوں ایک مصنف کو مصنف کے ساتھ ساتھ اچھا انسان بھی ہونا چاہئے اور یہ بات ڈاکٹر صاحب میں موجود ہے ہمارا ادارہ ڈاکٹر صاحب کی کتابیں شائع کر کے خوشی محسوس کر رہا ہے اور انکی مزید کتب بھی ہمارے ادارے سے جلد شائع ہوں گی۔

آصف حسن

خالد سہیل کی تخلیقات

۱۔ تلاش ---------- شاعری
۲۔ زندگی میں خلا ---------- افسانے
۳۔ بھگوان۔ ایمان۔ انسان ۔۔۔ فلسفیانہ مضامین کے تراجم
۴۔ انفرادی اور معاشرتی نفسیات ---------- مضامین
۵۔ آزاد فضائیں ---------- شاعری
۶۔ مغربی عورت ادب اور زندگی ---------- تراجم
۷۔ دو کشتیوں میں سوار ---------- افسانے
۸۔ کالے جسموں کی ریاضت ۔۔۔ افریقی ادب کے تراجم
۹۔ ایک باپ کی اولاد ۔۔۔ فلسطینی اور اسرائیلی ادب کے تراجم
۱۰۔ ٹوٹا ہوا آدمی ---------- ناولٹ
۱۱۔ سمندر اور جزیرے ---------- شاعری
۱۲۔ دھرتی ماں اداس ہے ---------- افسانے
۱۳۔ ہر دور میں مصلوب ۔۔۔ گے اور لیسبین ادب کے تراجم
۱۴۔ امن کی دیوی ۔۔۔ عراق کی جنگ کی تخلیقات کے تراجم
۱۵۔ خدا مذہب اور ہیومنزم ۔۔۔ فلسفیانہ مضامین کے تراجم
۱۶۔ دریا کے اس پار ---------- ناولٹ
۱۷۔ ورثہ ---------- عالمی لوک کہانیوں کے تراجم
۱۸۔ پگڈنڈیوں پہ چلنے والے مسافر ۔۔۔ ادیبوں کے انٹرویو
۱۹۔ سماجی تبدیلی۔ ارتقا یا انقلاب ۔۔۔ سیاسی مضامین
۲۰۔ القاعدہ امریکہ پاکستان ---------- سیاسی مضامین
۲۱۔ شائیزوفرینیا ---------- نفسیات کے آئینے میں